إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

فروری ۲۰۲۲ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ کے زیر انتظام

تدریس القرآن پراجیکٹ

فری کتابیں اور فری ٹیچرز ٹریننگ

* سکولوں میں آسان انداز میں ترجمۂ قرآن سکھانے کا پروگرام
* پانچویں جماعت سے اوپر کی جماعتوں کے لیے
* اساتذہ کی گائیڈ اور طلبہ کی کتاب بلاترجمہ الگ
* دو رنگوں میں نفیس طباعت
* لاہور کے سکولوں میں تنفیذ کی خصوصی مہم جاری ہے
* لاہور کے تقریباً ۱۰۰۰ سکولوں میں تدریس القرآن کے ذریعے ترجمۂ قرآن سکھایا جارہا ہے۔

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ

15 شیر شاہ بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور

0300-4107282   300-4354673

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

عصری تعلیم کی اصلاح

ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل

اسلامی سکول کے خدوخال

تعلیم اور اس کا اسلامی کردار

یکساں قومی نصاب - خدشات و مضمرات

تدریس القرآن ① برائے معلمین

تدریس القرآن ① برائے طلبہ وطالبات

پنج سورہ (اُردو تفہیم)

اسلامی علوم میں تحقیق: اصول، ترجیحات اور معیار

ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت

طلبہ کی اسلامی تربیت

تعلیمی ادارے اور کردار سازی

تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت - ہینڈ بک و گائیڈ

اصلاحِ دینی مدارس

ہمارا دینی نظام تعلیم

نصابِ مدنیؒ

مدرسہ ڈسکورسز - مطالعہ وتجزیہ

اصلاحِ دینی مدارس

اسلامی تحریکیں

پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟

ایک نئی ہمہ جہت اصلاحی تحریک کی ضرورت

خاموش انقلاب - ناگزیر ہے

عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور

تزکیۂ نفس

اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)

حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)

اپنی اصلاح آپ کیسے؟

ترکِ رذائل (احمد جاوید)

اسلام اور تعمیر سیرت (زیر طبع)

مغربی فکر وتہذیب

اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش

اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ

اسلام اور ردِّ مغرب

فہم دین

مسلم نشاۃ ثانیہ - اساس اور لائحہ عمل

مقالاتِ امین (جلد اوّل)

مقالاتِ امین (جلد دوم)

شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور۔ فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com

ماہنامہ
البرہان
لاہور

جلد ۲۶، شمارہ ۲، فروری ۲۰۲۲ء/ جمادی الثانی ۱۴۴۳ھ

مشمولات

○فکر و نظر
- نعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم — احمد جاوید — ۴
- اسٹیبلشمنٹ سے ایک گزارش — مدیر — ۵

○تعلیم و تربیت
- یکساں قومی نصاب میں یک طرفہ ردو بدل — ڈاکٹر محمد امین — ۷
- ہماری یونیورسٹیوں میں کیا ہو رہا ہے؟ — اسرار احمد خاں — ۱۴
- جدید نظام تعلیم کی ناکامی لیکن الزام علماء پر؟ — محمد عاصم حفیظ — ۱۷
- ایک نئی طرز کا دینی مدرسہ — مولانا سید سلیمان ندویؒ — ۲۲
- عصرِ حاضر میں علوم کی اسلامی تشکیل (۲) — مدیر — ۲۳

○تزکیۂ نفس
تحریکِ ایمان وتقویٰ - ایک تعارف — مولانا مختار الدین شاہ — ۳۳

○فہم دین
- دینی دعوت میں عوام سے رابطے کی اہمیت — مولانا ابوالحسن علی ندویؒ — ۴۱
- نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائضِ منصبی — مولانا محمد یوسف بنوریؒ — ۴۲
- غامدی کے بارے میں البرہان کا سخت مؤقف کیوں؟ — مدیر — ۴۵

○تفہیم مغرب
- مغربی سائنس - منزل ہے کہاں تیری؟ — ادریس آزاد — ۵۴

○عالم اسلام
بوسنیا، یوکرائن، قازقستان، سعودی عرب، بھارت — مدیر — ۶۹

○افغانستان
- افغان معیشت پر سامراجی حملہ — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۷۶
- افغانستان: عوامی اسلامی حلقوں کی حمایت سے محروم کیوں؟ — ۸۰

مدیر
ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ عمران رضا طحاوی

لیگل ایڈوائزر
محمد یحییٰ رشید، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0309-4607124)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 70 روپے
سالانہ 800 روپے- پانچ سال: 4000 روپے
تاحیات 15,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
15 شیر شاہ بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور
ermpak@hotmail.com

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhanmonthly.org

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

نعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نہ کوئی دل سا غنی ہے نہ کوئی دل سا فقیر
اُن کے الطاف کے بعد، اُن کی عطا سے پہلے
قلبِ صدیقؓ و عمرؓ، سینۂ عثمانؓ و علیؓ
چمنِ عشق ہیں ایجادِ صبا سے پہلے
دل نے سو بار سنی غیب سے آوازِ قبول
ایک، بس ایک، فقط ایک دعا سے پہلے
دعوئ عشقِ رسالت میں نہ جلدی کیجیے
اس کی توثیق تو ہو، خوفِ خدا سے پہلے
کچھ نہ تھے انفس و آفاق، زمین و افلاک
ان کے نور، ان کے ظہور، ان کی صبا سے پہلے
کچھ نہیں، ہاں! بخدا کچھ بھی نہیں دیدہ و دل
ان کے دیدار سے قبل، ان کی لقا سے پہلے
عازمِ طیبہ پہ لازم ہے کہ آدابِ سفر
پوچھ کر نکلے کسی مردِ خدا سے پہلے
دیکھا جاتا ہے وہاں دیدۂ تر، قلبِ سلیم
ریش و سجادہ و دستار و قبا سے پہلے
ہوسِ جاہ کہاں، عشقِ شہنشاہ کہاں
سینہ خالی تو کرو کبر و رِیا سے پہلے
دشتِ پُرخارِ محبت میں قدم رکھتے وقت
پوچھ ہی لیتے کسی آبلہ پا سے پہلے
دل میں اک مہرِ جہاں تاب ہے جو بہرِ طلوع
اِذن لیتا ہے شہِ ہر دو سرا سے پہلے
مَیں تو بس چشمِ ندامت سے انھیں دیکھوں گا
وزنِ اِعمال سے، اعلانِ سزا سے پہلے

احمد جاوید

فکرونظر

پاکستان کا سیاسی نظام

تبدیلی ناگزیر ہے لیکن تبدیلی لائے گا کون؟

اسٹیبلشمنٹ سے ایک گزارش

ہم اسٹیبلشمنٹ سے جو سیاسی گزارش کرنے چلے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاست میں اسٹیبلشمنٹ کا اثر ایک زمینی حقیقت ہے۔ سیاسی جماعتوں کو ہماری تجویز کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہ ان کی کمزوری اور نالائقی ہی ہے کہ پاکستان کے سیاسی نظام میں تبدیلی کے لیے ہمیں اسٹیبلشمنٹ کی طرف دیکھنا پڑ رہا ہے۔

ہمارے نزدیک پاکستان کے سیاسی نظام میں مندرجہ ذیل تین بڑی خرابیاں موجود ہیں جن کی اصلاح کے بغیر ملک آگے نہیں بڑھ سکتا:

۱۔ پاکستان میں آج تک جتنی اسمبلیاں بنی ہیں اور اس ملک میں جتنی سیاسی جماعتیں حکومت بناتی رہی ہیں، وہ سب معاشی لحاظ سے ملک کے ۹۰ فیصد عوام کی یعنی غریبوں اور متوسط طبقے کی نمائندگی نہیں کرتیں بلکہ وہ چند فیصد سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

۲۔ پاکستان میں آج تک جتنی اسمبلیاں اور حکومتیں بنی ہیں وہ ملک کے ۹۰ فیصد عوام کی دینی امنگوں کی نمائندگی نہیں کرتیں بلکہ ملک کے مغرب زدہ سیکولر، لبرل اور دینی تعلیمات پر عمل نہ کرنے والے عناصر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ انہوں نے کبھی افراد معاشرہ کو دین پر عمل کے قابل بنانے کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا اور نہ کبھی پاکستان کے تعلیمی، ثقافتی، اخلاقی سیاسی، معاشی اور معاشرتی پہلوؤں کو اسلام کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے۔

۳۔ اس ملک میں آج تک جتنے بھی حکمران آئے ہیں سب مغربی ملکوں (خصوصاً امریکہ ویورپ) کی غلامی قبول کرنے والے اور ان کے دباؤ پر مغربی مفادات کو آگے بڑھانے اور مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کو اپنانے اور اپنے ہاں نافذ کرنے والے تھے۔ انہوں نے تحریک پاکستان، دوقومی نظریے اور پاکستانی دستور کے مطابق کبھی پاکستان کی حقیقی آزادی، استحکام اور

اس کے اسلامی کردار کو اُجاگر کرنے کی کوشش نہیں کی۔

آج کل یہ افواہیں گردش کر رہی ہیں کہ اسٹیبلشمنٹ موجودہ حکومت سے خوش نہیں اور یہ کہ اس کی حریف دوسری سیاسی جماعتیں ڈھکے چھپے الفاظ میں اسٹیبلشمنٹ کی حمایت کا دعویٰ کر رہی ہیں کہ یہ حکومت جلد ختم ہو جائے گی اور وہ حکومت بنائیں گی۔ چلیے یہ حکومت اپنی مدت پوری بھی کر لے تو ۲۰۲۳ء میں اگلے الیکشن تو ہوں گے۔ کیا ان میں پھر یہی سیکولر و لبرل سیاسی جماعتیں اسٹیبلشمنٹ کی حمایت سے جیتیں گی اور حکومت بنائیں گی؟ کیا پاکستانی عوام کے مقدر میں کوئی تعمیری تبدیلی نہیں؟ کیا یہاں کوئی ایسی سیاسی جماعت برسر اقتدار نہیں آسکتی جو ۹۰ فیصد عوام کی حقیقی نمائندہ ہو اور عوام میں جڑیں رکھتی ہو۔

اگر اسٹیبلشمنٹ اس ملک کے سیاسی نظام میں بہتری لانا چاہتی ہے تو اس کے لیے ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ موجودہ سیاسی جماعتوں کو تاریخ کے کباڑ خانے میں پھینک دے اور ایک نئی سیاسی جماعت بنوائے جو ۹۰ فیصد پاکستانی عوام کی حقیقی نمائندہ ہو۔ خصوصاً سطور بالا میں جو تین نکات ہم نے ذکر کیے ہیں ان کے لحاظ سے نمائندہ ہو یعنی وہ ۹۰ فیصد غریبوں اور متوسط طبقے کی نمائندگی کرے، ۹۰ فیصد اسلام پسند عوام کی ترجمانی کرے، مغربی فکر و تہذیب کی بجائے اسلامی تعلیمات پر عمل کرے اور امریکہ و یورپ کے مفادات کی بجائے پاکستانی مفادات کی نگہبانی کرے۔ اسٹیبلشمنٹ کو چاہیے کہ وہ ایسی نئی سیاسی جماعت قائم کرے اور موجودہ سیاسی جماعتوں کی سرپرستی چھوڑ دے۔

بقیہ: ہماری یونیورسٹیوں میں کیا ہو رہا ہے؟

یہ تمام تر اسباب اور عوامل یہاں قائداعظم یونیورسٹی میں زیر تعلیم مستقبل کے معماروں کو ہر پہلو سے تباہ کر رہے ہیں۔ یہ اسی کا مظہر ہے کہ گذشتہ دنوں اس تعلیمی درسگاہ میں پانچ طلبہ کو دن دہاڑے اغوا کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ وجہ صرف یہ کہ انہوں نے جامعہ میں چلتے شیطنت کے اس سیاہ دھندے کو سفید کہنے سے انکار کیا۔ ہم قائداعظم یونیورسٹی اور شہری انتظامیہ سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے یونیورسٹی کے اس قضیے کو سنجیدگی سے حل کرنے کے لیے موثر کوششیں کریں ورنہ یہ صورت حال کسی بڑے سانحے اور المیے کو جنم دے سکتی ہے۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

سیکولر اور لبرل عناصر کی طرف سے

یکساں قومی نصاب میں یک طرفہ ردوبدل

اور پاکستان کے نظریاتی تشخص اور اخلاقی اقدار پر حملہ

قومی نصاب ایک اہم قومی دستاویز ہوتا ہے جو کسی ملک کے قومی مقاصد کی تکمیل کرتا ہے اور اس کی بقاء کا ضامن ہوتا ہے۔اس قومی دستاویز کی روشنی میں درسی کتابیں تیار کی جاتی ہیں۔اس سے آنے والی نسلوں کی تربیت ہوتی ہے، وہ ترقی کرتی ہیں اور اپنے مذہب، تاریخ اور ثقافت سے آگاہ رہتی ہیں۔

پاکستان میں ۲۰۰۶ء کا نصاب رائج تھا۔موجودہ حکومت نے سنگل نیشنل کریکولم ۲۰۲۰ء کروڑوں روپے کے اخراجات سے تیار کیا۔اس پر درسی کتب تیار کی گئیں جو صوبہ پنجاب، خیبر پختون خواہ اور اسلام آباد میں اس سال سے نافذ ہیں۔بغیر کسی وجہ کے اب ۲۰۲۱ء میں پرائمری کا ایک نیا نصاب تیار کر دیا گیا ہے جس میں متعدد خامیاں ہیں۔عجب منطق ہے جو سمجھ سے بالاتر ہے۔قومی خزانے کو نقصان پہنچایا جارہا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ گویا کسی خفیہ ایجنڈے کا حصہ ہے۔

ہم قومی مفاد میں قارئین کی توجہ اس اہم اور حساس معاملہ کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ حالیہ سنگل نیشنل کریکولم کی آڑ میں اسلام آباد میں ایک مخصوص آزاد خیال لابی کے لوگ نیشنل کریکولم کونسل (NCC) کے پلیٹ فارم سے قومی نصاب میں پاکستان اور اسلام دشمنی کا زہر انڈیل رہے ہیں۔ان کی بروقت سرکوبی نہ کی گئی تو آئندہ نسلیں ہمیں معاف نہیں کریں گی۔ گزشتہ دو ماہ کے دوران جو اقدامات کیے گئے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔اردو اور انگریزی کے نصاب سے اسلامی اور اخلاقی اسباق کی فہرست غائب کر دی گئی ہے۔

۲۔ جماعت چہارم اور پنجم کے نصاب سے قومی شاعر علامہ اقبال پر سبق نکال دیا گیا ہے۔

۳۔ جماعت دوم، چہارم اور پنجم کے جنرل نالج اور سوشل اسٹڈیز کے نصاب میں خواجہ سرا

(Transgender) کے غیر ضروری تصور کو شامل کر دیا گیا ہے جو اس عمر کے بچوں کے لیے ناگوار اور نا قابل فہم ہے۔ یہ ہم جنس پرستی کو متعارف کرانے کی طرف ایک قدم لگتا ہے جو مغربی ملکوں کا ایجنڈا ہے۔

۴۔ تاریخ کے نصاب (سوشل اسٹڈیز، جماعت چہارم اور پنجم) سے پاکستان کی تخلیق میں صوبوں اور وفاق کی اکائیوں کے کردار پر عنوان کو کمزور کر کے اقلیتوں کے کردار کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔

۵۔ پاکستان اسٹڈیز کے نصاب جماعت نہم و دہم سے اسلام کے، جو پاکستان کی نظریاتی بنیاد ہے، پورے باب کو خارج کر کے پاکستان کی تاریخی بنیادوں کو کمزور کیا جا رہا ہے۔

۶۔ اسلامیات کے ششم تا ہشتم جماعتوں کے نصاب سے اہم مشاہیر اسلام مثلاً حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، امام غزالیؒ، صلاح الدین ایوبیؒ، طارق بن زیادؒ، بوعلی سیناؒ وغیرہ سے متعلقہ مضامین کو نکال دیا گیا ہے۔

ان آزاد خیال اور مغرب زدہ لوگوں کے ہاتھ نہ روکے گئے تو آئندہ آنے والی نسل اسلامی تاریخ، ثقافت اور حب الوطنی سے عاری ہوگی۔ یہ اس ملک کو کمزور کرنے اور توڑنے کی مذموم کوشش ہے جسے فوری طور روکنا ہوگا۔

حکومت فوری طور پر ایک کمیٹی بنائے جو تمام سیاسی جماعتوں، علماء کرام اور پبلک سیکٹر یونیورسٹیوں کے شعبۂ تعلیم کے اساتذہ پر مشتمل ہو جو اس اہم معاملے کا جائزہ لے اور اقدامات تجویز کرے۔

سطور بالا میں ہم نے جو عرض کیا ہے، اس کا ایک پس منظر ہے اور اس کی کچھ تفصیل ہے جو ہم عرض کرتے ہیں:

پسِ منظر

پاکستان میں ایک چھوٹا سا گروپ ایسا ہے جو پاکستانی آئین کی اسلامی بنیادوں کو بدل کر اسے ایک سیکولر ملک بنانا چاہتا ہے یہ گروپ اگرچہ تعداد میں چھوٹا ہے مگر اس کا اثر ورسوخ وسیع

ہے خصوصاً امیر طبقے، بیوروکریسی اور غیر ملکی امداد سے چلنے والی این جی اوز کی اسے در پردہ حمایت حاصل ہے۔ دو سال پہلے موجودہ حکومت نے ایک قوم ایک نصاب (Single National Curriculum-SNC) کے نعرے کے تحت نئے نصاب کی تشکیل شروع کی۔ یہ نصاب ۲۰۲۰ء میں منظور ہوا اور پھر اس کی درسی کتب تیار کی گئیں جو ۲۰۲۱ء کے تعلیمی سال سے پنجاب، صوبہ پختون خواہ اور اسلام آباد میں جولائی ۲۰۲۱ء سے نافذ ہو چکی ہیں۔ جب یہ درسی کتب شائع ہوئیں تو چند نام نہاد سیکولر دانشوروں (مثلاً ڈاکٹر پرویز ہود بھائی، ڈاکٹر نیر وغیرہ) اور مغربی ممالک سے فنڈز وصول کرنے والی این جی اوز نے شور مچانا شروع کر دیا کہ اس نئے نصاب میں اسلامی معلومات اور اسلامی تاریخ اور ثقافت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے حالانکہ یہ درست نہیں تھا۔ بہر حال ان لوگوں نے میڈیا پر ایک مہم چلائی۔ ۲۰۲۱ء کے اوائل تک قومی نصاب کونسل کے سربراہ سرکاری شعبہ تعلیم میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے اور پاکستانی سوچ کے حامل پروفیسر رفیق طاہر تھے۔ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد سیکولر ذہن رکھنے والے وفاقی وزیر تعلیم شفقت محمود نے غیر ملکی آقاؤں کے اشارے پر ایک پرائیویٹ یونیورسٹی (LUMS) کی ایک ناتجربہ کار مگر ماڈرن خیالات رکھنے والی اور اسلامی تاریخ و ثقافت کی مخالف ڈاکٹر مریم چغتائی کو قومی نصاب کونسل کا سربراہ مقرر کر دیا جس نے آتے ہی پرائمری کے منظور شدہ نصاب کو از سر نو تیار کرنے کا حکم دیا حالانکہ اس پر پہلے ہی کروڑوں کے سرکاری وسائل خرچ ہو چکے تھے۔ گزشتہ چند ماہ کے دوران ڈاکٹر مریم چغتائی نے پرائمری کے منظور شدہ (۲۰۲۰ء) کے نصاب اور مڈل و ثانوی کے صوبائی ماہرین کے توثیق کردہ مسودوں میں ایسی بنیادی تبدیلیاں شروع کر دیں جن کا مقصد نئی نسل کو اپنے دین، اسلامی تاریخ اور نظریۂ پاکستان سے بے خبر رکھنا ہے۔ ان کوششوں کا خلاصہ درج ذیل ہے:

اردو اور انگریزی کی درسی کتب سے اسلامی مواد کا خاتمہ

کسی بھی زبان سکھانے کی درسی کتب میں متعلقہ زبان کی گرامر سکھانے کے ساتھ اس کے ذخیرۂ الفاظ کو بھی متعارف کروانا ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ ذخیرہ الفاظ میں محض بے ربط عبارت کے ذریعے اضافہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے درسی کتب لکھنے والے مصنفین کی رہنمائی کے لیے ہمیشہ نصاب میں اسباق کے موضوعات کی ایک فہرست (List of Themes or Topics) بھی

شامل کی جاتی ہے۔ یہ اسباق یا موضوعات بچوں کی اخلاقی تربیت، واقفیت عامہ، قومی معاشرت اور اقدار سے متعلق ہوتے ہیں۔ انگریزی و اردو مضامین کے سابقہ تمام نصابوں میں درسی اسباق کے موضوعات کی فہرست شامل تھیں مگر ڈاکٹر مریم چغتائی نے دسمبر ۲۰۲۱ء میں پرائمری نصاب کا جو نیا مسودہ ویب سائٹ پر جاری کیا ہے اس مسودے سے درسی اسباق کے موضوعات کو نکال دیا گیا ہے۔ سیکولر گروپس ہمیشہ اس پر کٹرھتے رہے ہیں کہ اردو کی درسی کتاب میں حمد اور نعت کیوں ہے؟ سیرتِ نبوی کے اخلاق آموز واقعات کیوں ہیں؟ حال ہی میں سیکولر گروپ اور مغربی ممالک کی امداد سے چلنے والے ایک تھنک ٹینک نے سپریم کورٹ میں درخواست دی ہے کہ اردو انگریزی کی درسی کتب سے اسلامی مواد کو خارج کیا جائے۔ ڈاکٹر مریم چغتائی ایسے سیکولر اور لبرل گروہوں کو خوش کرنے کے لیے اس قسم کے اقدامات کر رہی ہیں۔

نئی نسل کو ہم جنسی کی جانب مائل کرنے کی کوشش

یورپ اور امریکہ میں جنسی بے راہروی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ وہاں ہم جنس پرستی جیسے برے فعل کو قانونی شکل دلوانے کے لیے تنظیمیں بن چکی ہیں۔ اس تنظیم کا نام (Lesbians, Gay, Bi-sexual Transgender-LGBT) ہے یہ تنظیم ہر ملک میں بظاہر خواجہ سراؤں یا زنخوں کے حقوق کے لیے این جی اوز کو فنڈز دیتی ہے مگر اس کے در پردہ ان کا مقصد ہم جنس پرستی کو فروغ دینا ہوتا ہے۔ اسی ایجنڈے کی تکمیل کے لیے ڈاکٹر مریم چغتائی نے پرائمری کے نئے نصاب میں جماعت دوم، چہارم اور پنجم میں ٹرانس جینڈر (Transgender) کے تصور کو مرد اور عورت کے ساتھ ایک تیسری جنس کے طور پر متعارف کروایا ہے۔ جماعت چہارم کے نصاب میں دیگر دو صنفوں (مرد اور عورت) کے ساتھ ٹرانس جینڈر یعنی زنخوں کے مختلف پیشوں میں کارنے نمایاں پر مضامین لکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ بطور انسان زنخوں کے شہری حقوق یکساں ہیں اور کوئی پاکستانی اس سے انکار نہیں کرتا۔ ملک کے بعض علاقوں میں زنخوں پر حملے کے واقعات تب رونما ہوتے ہیں جب وہ غیر اخلاقی حرکات کی لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔ کسی اسلامی ملک بلکہ ایشیا کے کسی ملک میں پرائمری سطح کے نصاب میں نہ تو زنخوں کو متعارف کروایا گیا ہے اور نہ ہی ان کی تعریفوں کے پل باندھے گئے ہیں۔ نصاب میں زنخوں کو متعارف کروانا ہم جنسی اور جنسی بے راہروی کو فروغ دینے کی طرف پہلا قدم ہے۔ علما اور ماہرین تعلیم کو اس اقدام کو روکنے کے

اقدامات کرنے چاہئیں اور جس شخص نے بیرونی امداد لے کر یہ گھناؤنا کام کیا ہے اس کے خلاف سخت قانونی کاروائی کی جائے۔

نصاب سے ڈاکٹر علامہ اقبال کے سبق کا اخراج

ماضی کے ہر نصاب میں پرائمری سے اعلیٰ ثانوی سطح تک ہر جماعت میں قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے اسباق شامل ہوتے رہے ہیں کیونکہ یہ دونوں شخصیات ہماری محسن ہیں اور تشکیلِ پاکستان میں ان کا کردار ہے۔ ۲۰۲۰ء کے منظور شدہ نصاب برائے جنرل نالج میں جماعت سوم میں قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے اسباق شامل تھے (صفحہ نمبر ۴۴ نصاب جنرل نالج) اسی طرح ۲۰۲۰ء کے سوشل سٹڈیز کے نصاب میں قائداعظم اور علامہ اقبال دونوں پر اسباق موجود تھے (صفحہ نمبر ۲۰ نصاب برائے سوشل سٹڈیز ۲۰۲۰ء)۔ اس کے بعد جماعت پنجم کے سوشل سٹڈیز کے نصاب میں قائداعظمؒ کی حصولِ پاکستان کی جدوجہد پر ایک سبق شامل تھا (صفحہ ۲۷ نصاب سوشل سٹڈیز جماعت پنجم سال ۲۰۲۰ء) ڈاکٹر مریم چغتائی کے نئے تیار کردہ ۲۰۲۱ء کے نصاب میں سے علامہ اقبالؒ کے سبق کو جماعت چہارم سوشل سٹڈیز سے نکال دیا گیا ہے جبکہ قائداعظمؒ کی شخصیت اور جدوجہد پر تین میں سے دو اسباق ختم کر کے صرف ایک سبق کو رکھا گیا ہے اور ان کی جگہ ایسی شخصیات کو شامل کیا گیا ہے جن کا پاکستان بننے سے پہلے کوئی قابل ذکر کردار نہیں تھا البتہ پاکستان بننے کے بعد انہیں بعض وجوہات کی بنا پر شہرت ملی۔ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ جیسی اہم شخصیات سے نئی نسل کو بے خبر رکھنا پاکستان دشمنی کا ثبوت ہے۔ اس معاملے کی تحقیق ہونی چاہیے۔

پاکستان کی نظریاتی بنیادوں پر باب میں تبدیلی

۲۰۰۶ء کے قومی نصاب میں مطالعہ پاکستان کے مضمون کے تحت ایک اہم باب پاکستان کی اسلامی نظریاتی بنیادوں کے بارے میں تھا جس میں واضح طور پر جو نکات شامل تھے ان میں: ۱۔ تحریکِ پاکستان کی بنیاد اسلام اور مسلمانوں کی معاشی پسماندگی ۲۔ دوقومی نظریہ اور ۳۔ قرار دار مقاصد شامل تھے (بحوالہ باب نمبر 1 صفحہ نمبر 2 اور باب نمبر 4، صفحہ نمبر 6) ۔ اٹھارویں ترمیم کے بعد جب صوبوں نے اپنا اپنا نصاب بنایا تو حکومت پنجاب نے ۲۰۰۶ء کے نصاب کو ۲۰۱۹ء میں قانونی طور پر اپنا لیا اور پنجاب کے نصاب مطالعۂ پاکستان میں درج بالا

تینوں نکات شامل تھے اور ابھی تک شامل ہیں۔ دسمبر ۲۰۲۱ء کے دوران ڈاکٹر مریم چغتائی نے مطالعۂ پاکستان کا جو نیا نصاب مرتب کر کے اپنی ویب سائیٹ پر ڈالا تو اس میں نظریہ پاکستان کی اسلامی بنیادوں کے باب کا نام بھی تبدیل کر دیا اور اس میں سے اسلامی بنیادوں اور قرارداد مقاصد کے نکات نکال دیے۔ اب اس باب کا نام بدل کر تحریک پاکستان کا تاریخی اور ثقافتی پس منظر رکھ دیا گیا ہے اور اس میں سے اسلامی پس منظر نکال کر اِدھر اُدھر کی باتیں شامل کر دی گئی ہیں۔ یہ پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو مسمار کرنے اور پاکستانی قوم کی ہم آہنگی کو کمزور کرنے کی کوشش ہے۔

اسلامیات کے نصاب سے اہم مشاہیرِ اسلام کا اخراج

۲۰۰۶ کے قومی نصاب اسلامیات برائے ششم تا ہشتم میں ایک اہم باب بعنوان 'ہدایت کے سرچشمے' اور 'مشاہیر اسلام' شامل تھا۔ ۲۰۲۰ء کے اسلامیات کے مڈل کے نصاب میں بھی یہ باب شامل تھا۔ اب ۲۰۲۱ء میں اگرچہ یہ باب شامل ہے مگر اس میں پندرہ اہم مشاہیر کے نام نکال دیے گئے ہیں۔ جن کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ حضرت خالد بن ولیدؓ	۲۔ حضرت سلمان فارسیؓ	۳۔ حضرت امام غزالیؒ
۴۔ ابن خلدون	۵۔ محمد بن قاسم	۶۔ محمود غزنوی
۷۔ قتیبہ بن مسلم	۸۔ صلاح الدین ایوبیؒ	۹۔ موسیٰ بن نصیر
۱۰۔ طارق بن زیاد	۱۱۔ جابر بن حیان	۱۲۔ ابن الہیثم
۱۳۔ محمد بن موسیٰ الخوارزمی	۱۴۔ ابونصر فارابی	۱۵۔ بوعلی سینا

درج بالا شخصیات کے نام اسلامیات برائے ششم تا ہشتم کے ۲۰۲۰ء کے مسودے یعنی ڈرافٹ میں موجود تھے جو اب بھی وزارت تعلیم کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔ ۲۰۲۰ء کا ڈرافٹ متعلقہ علماء اور صوبائی شعبہ ہائے نصاب کی مشاورت سے تیار ہوا تھا اور اس مشاورت کے بعد آٹھ دس ماہ پہلے اسے وزارت تعلیم کی ویب سائیٹ پر ڈالا گیا تھا۔ یہ تمام نام ہدایت کے سر چشمے اور مشاہیر اسلام کے عنوان کے تحت ۲۰۲۰ء کے مڈل کے ڈرافٹ نصاب میں شامل تھے۔

یوں لگتا ہے کہ مسلم فاتحین اور سیاستدانوں کو دانستہ طور پر نکالا گیا ہے۔ یہ ایک لمحہ فکر یہ ہے۔ اسلامیات کے جنرل مشرف کے دور میں تیار کردہ قومی نصاب ۲۰۰۶ء سے اگر اس کا موازانہ کیا جائے تو اس کے نتیجے میں یہ سامنے آتا ہے کہ ۲۰۰۶ء کے نصاب میں بھی متذکرہ بالا اکثر مشاہرین کے نام موجود تھے۔

نصاب سازی کے بارے میں یک طرفہ فیصلے اور صوبوں کی عدم شمولیت

۱۹۷۳ء سے اب تک ہر مضمون کے نصاب کی تشکیل میں صوبوں کی رائے کو شامل کیا جا تا رہا اور کوئی نصاب وفاقی حکومت نے بغیر صوبوں کی مشاورت کے منظور نہیں کیا تھا۔ ہر صوبے میں تعلیمی نصاب کا ایک الگ شعبہ موجود ہے جہاں ہر مضمون کے ماہرین تعینات ہیں۔ اٹھارویں ترمیم کے بعد اب وفاقی وزارت تعلیم کے پاس نصاب سازی کا آئینی اور قانونی اختیار باقی نہیں رہا۔ قومی نصاب کونسل (National Curriculum Council-NCC) ایک ترقیاتی پراجیکٹ ہے اس کی کوئی مستقل قانونی حیثیت نہیں۔ ڈاکٹر مریم چغتائی نے صوبوں سے مشاورت کرنے کی بجائے یک طرفہ طور پر بعض این جی اوز کے فراہم کردہ پرائیویٹ سیکولر لوگوں کو بلا کر پرانے نصاب میں اپنی مرضی کی کانٹ چھانٹ کی اور رسمی کارروائی کے لیے نئے نصاب کے مسودوں کو ویب سائیٹ پر اپ لوڈ کر دیا۔ صوبوں میں سرکاری ماہرین تعلیم کی اکثریت کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے استعمال سے ناآشنا ہے۔ اس لیے اکثر صوبائی ماہرین نے نئے مسخ شدہ نصاب کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا۔ کاروائی ڈالنے کے لیے ڈاکٹر مریم چغتائی نے صوبائی دارالحکومتوں میں چند گھنٹوں کے سیمینار نما اجلاس منعقد کئے مگر صوبائی ماہرین نصاب کو اپنی تجاویز اور اعتراضات پیش کرنے کا موقع نہیں دیا۔ ڈاکٹر مریم چغتائی کا اپنی مرضی سے نصاب میں ردوبدل اور دانستہ طور پر صوبائی مشوروں کو اہمیت نہ دینا غیر قانونی عمل اور ڈکٹیٹر شپ ہے۔ اگر حکام بالا، پارلیمنٹ کے اراکین اور علماء دین نے اس غیر قانونی عمل کو نہ روکا تو اس سے ملک کی اسلامی نظریاتی بنیادوں کو شدید نقصان پہنچے گا اور ہماری نئی نسلوں میں حب الوطنی کمزور ہوگی اور جنسی بے راہ روی میں اضافہ ہوگا۔

تعلیم و تربیت

اسرار احمد خان[1]

ہماری یونیورسٹیوں میں کیا ہو رہا ہے؟

* پنجاب یونیورسٹی اور بین الاقوامی یونیورسٹی کے بعد اب قائد اعظم یونیورسٹی میں بھی لسانی اور علاقائی تنظیموں کی دہشت گردی۔ اسلام کا نام لینا جرم قرار دے دیا گیا۔
* پنجاب اور مرکز پسماندگی کے نام پر بلوچ اور پشتون طلبہ کو مخصوص نشستیں دینے کے نتیجے پر غور فرمائیں۔

کسی بھی ملک کے تعلیمی ادارے اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے خصوصاً اس کے مستقبل کی پرچھائیں ہوا کرتے ہیں۔ یہیں پر ملک کی علمی، معاشی، تکنیکی اور سماجی ترقی کو فروغ دینے والے دماغ اور ہاتھ تیار ہو کر ملک کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں۔ وہ نسل تیار ہوتی ہے جو کل کو اس ملک، قوم اور معاشرے کی باگ ڈور سنبھالتی ہے۔ ان اداروں سے یہی نئی نسل قوم کو دشوار راہوں پر آگے لے کر بڑھتی ہے اور کامیابی سے منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

انہی عزائم، اغراض اور مقاصد کے تحت ۱۹۶۷ء میں پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں ایک بین الاقوامی معیار کی درس گاہ اسلام آباد یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ بعد ازاں اسے بانیٔ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کے خواب کی تعبیر کی کڑی بناتے ہوئے ان کے نام سے موسوم کر کے 'قائد اعظم یونیورسٹی' کا نام دیا گیا۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور دیگر صاحبانِ علم و فضل کی شبانہ روز محنت نے اسے بہت جلد بین الاقوامی مقام دلوا دیا۔ آج مارگلہ کے دامن میں سرسبز درختوں اور بہتے جھرنوں میں گھری، ڈیزی اور جیسمین کی خوشبو سے مہکتی اور کتنے ہی خوش گلو پرندوں کی چہچہاہٹ میں بسی قائد اعظم یونیورسٹی یقیناً علمی دنیا میں ایک اعجاز اور ایک عجوبہ ہے۔

مگر یہ تمام تر رومانویت اور فسوں کاری اس وقت دم توڑ جاتی ہے اور یہ خوشنما منظر اس وقت دھندلانے لگتے ہیں جب ذرا پردے کو سرکا کر قائد اعظم یونیورسٹی کے زمینی حقائق اور حالات کا جائزہ لیا جائے۔

---

[1] قائد اعظم یونیورسٹی، اسلام آباد

اس یونیورسٹی میں آئے دن رونما ہونے والے واقعات، پروان چڑھتے منفی رویے اور انسانوں کو نسلی بنیاد پر تقسیم کرنے والے افکار یقیناً ہر ذی شعور انسان کے لیے پریشان کن ہیں اور کسی اوسط درجے کے مہذب انسان کے لیے بھی ان کو گوارا کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ گویا قائداعظم یونیورسٹی کی تصویر کا ایک رخ جتنا دلفریب اور خوشنما ہے، دوسرا رخ اتنا ہی دقیانوسی اور بدنما ہے۔

اس یونیورسٹی کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ یہاں پر سب کو فکر و عمل کی آزادی میسر ہے۔ مگر حقیقتِ حال یہ ہے کہ آزادی کے نام پر آزادی کا جس قدر استحصال اس یونیورسٹی میں ہو رہا ہے اس کی مثال کسی بھی سماج میں ملنا مشکل ہے۔ یہاں دقیانوسی نسلی سوچ اور مائنڈ سیٹ کو تو ہر طرح کی مادر پدر اور شتر بے مہار آزادی حاصل ہے اور اس سے اختلاف کرنے کا ادنیٰ اور اعلیٰ انسانی افکار کو اپنانے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اگر اس مخصوص طرزِ فکر و عمل کے دائرے سے نکل کر کوئی کچھ سوچنے، بولنے اور کرنے کی جسارت کرے تو اس کے لیے یہی قائداعظم یونیورسٹی ایک عقوبت خانے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

۲۲ دسمبر ۲۰۲۱ء کو پانچ طلبہ کے اغوا کا واقعہ اس کی تازہ ترین مثال ہے۔ جب ان کو یونیورسٹی کی ایک فکری تنظیم سے تعلق رکھنے کی وجہ سے نسل پرست لسانی کونسلز کی جانب سے اغوا کیا گیا، ان کے موبائل فون ڈیٹا سے چیزیں نکال کر ایک ہجوم کے سامنے لایا گیا اور وہاں ان پر دین اسلام کی تبلیغ اور دیگر الزام لگائے گئے۔ اغواء کاروں نے مسلسل ہجوم کو مشتعل کرنے کی کوشش کی تاکہ عبدالولی خان یونیورسٹی میں مشال خان کے قتل جیسا ماحول بنایا جائے۔ مثلاً ایک بے بنیاد الزام یہ لگایا کہ اغوا ہونے والوں نے سندھی اجرک کو جلایا تھا تاکہ سندھ سے تعلق رکھنے والوں کو اشتعال دلایا جائے۔ خیر اس واقعے کی اطلاع ملنے پر اسلام آباد انتظامیہ اور یونیورسٹی کی انتظامیہ کو بروقت مطلع کیا گیا لیکن اطلاع کے باوجود انہوں نے کوئی ایکشن نہیں لیا۔ بالآخر اسلام آباد انتظامیہ نے کئی گھنٹوں بعد چار طالب علموں کو بازیاب کروایا لیکن مزید دو طالب علموں کو بازیاب کرانے میں ۲۴ گھنٹے لگے۔ جن طالب علموں کو اغوا کیا گیا تھا ان کے مطابق ان کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا، ان کے شناختی کارڈز اور موبائل چھین لیے گئے، ان سے بالجبر بیانات ریکارڈ کروائے گئے، ویڈیوز بنوائی گئیں۔ چھینی ہوئی اشیا تاحال کونسلز والوں کے پاس ہیں اور وہ ان کو غیر قانونی طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اغوا شدہ طالب علموں کو طلبہ کے جرگہ کے سامنے پیش کیا

گیا، ان پر تبلیغِ دین کا الزام لگایا گیا اور اسی "جرم" کی پاداش میں ان پر ظلم روا رکھا گیا۔

یہ تمام باتیں ایک ویڈیو کلپ میں واضح طور پر دیکھی اور سنی جا سکتی ہیں جس میں قوم پرست کونسل کے عہدیداروں اور دیگر لوگوں کو بھی واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد پولیس نے پانچ معلوم اور چند نامعلوم لوگوں پر ایف آئی آر کاٹ دی۔ یونیورسٹی انتظامیہ اس سارے معاملے میں خاموش تماشائی بنی رہی اور طلبہ کے تحفظ کی ذمہ داری کو پورا کرنے میں ناکام رہی۔

یہ فقط ایک مثال ہے۔ بے شمار ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ مَیں پوری سنجیدگی سے فکر کی آزادی کی قدر کرنے والے دوستوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اس یونیورسٹی میں آپ کا لبرل نام اور چہرہ وہ لوگ استعمال کر رہے ہیں جن کو لبرل ازم کا مطلب تک نہیں معلوم۔ یہ کون سا لبرل ازم ہے جو دوسروں کو اپنے نظریات و افکار رکھنے اور ان کا اظہار کرنے سے روکتا ہے؟ نہ صرف روکتا ہے بلکہ استبداد اور تشدد اختیار کرتا ہے؟ یہ کون سی آزادیٔ رائے ہے جو صرف 6 قوم پرست لسانی کونسل کو ہی تنظیم سازی کی اجازت دیتی ہے اور کسی دوسرے علاقے جیسے کشمیر اور ہزارہ کو کیوں اپنی تنظیم بنانے کی اجازت نہیں ہے؟ کیوں کسی سیاسی پارٹی کے ونگ (جمعیت، آئی ایس ایف، پی ایس ایف، ایم ایس ایف وغیرہ) کو اجازت نہیں ہے؟ کیوں کسی مذہبی تنظیم کو اس کی اجازت نہیں؟

بولنے پر پابندی، سوچنے پر تعزیریں.... کوئی اس جبر کے خلاف بولے تو زبان کھینچ لی جائے۔ کوئی قلم اٹھائے تو ہاتھ قلم کر دیے جائیں۔ کوئی چلنا چاہے تو پیر کاٹ ڈالیں۔ کوئی اس خوابیدہ سماج میں کروٹ لینا چاہے تو کمر توڑ دیں۔ یعنی اس یونیورسٹی میں ایک مخصوص طبقے کی دقیانوسی سوچ، فکر اور طرزِ عمل کے لیے تو سب طرح کی آزادی ہے اور اس کے سوا باقی سب کے لیے اس فسطائیت کے پاس ایک ہی تحفہ ہے یعنی جبر و تشدد۔

اس سب کے پردے میں علیحدگی پسند عناصر کھل کر اپنا بھیانک کھیل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ملک دشمن افکار اور نظریات کی ترویج زوروں پر ہے۔ وہ ملک دشمن اور ریاست دشمن بیانیہ جو ملک کے کسی بھی حصے میں لائقِ گردن زدنی ہے، یہاں اسلام آباد کے اس حساس ترین مقام پر بانگِ دہل بغیر کسی خوف، روک اور رکاوٹ کے طلبہ میں پھیلایا جا رہا ہے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ٦)

تعلیم و تربیت　　　　محمد عاصم حفیظ

جدید نظامِ تعلیم کی ناکامی

اور الزام دینی مدارس اور علماء پر

یورپ ایک ہزار کلومیٹر کی ہائپر لوپ ٹرین بنا رہا ہے جو ۶۰۰ کلومیٹر فی گھنٹہ سے بھی زائد رفتار سے چلے گی۔ چین مصنوعی سورج چاند بنا رہا ہے، پھر چاند پر بستی بسائے گا۔ امریکہ مریخ پر آباد ہونے جا رہا ہے۔ اک نئی ٹیلی سکوپ خلاء میں بھیجی گئی ہے۔

دنیا چوتھے صنعتی انقلاب سے گزر کر اب آرٹیفشل انٹیلیجنس کے دور میں پہنچ چکی ہے۔ کمپیوٹر کی آٹھویں، نویں اور دسویں جنریشن کے پروسیسرز پہ کام ہو رہا ہے۔ نینو ٹیکنولوجی کی نیکسٹ جنریشن ڈیویلپ ہو رہی ہے۔ موبائل پروسیسر ناقابل یقین رفتار پہ لے جایا جا رہا ہے۔ ٹیسلا انتہائی مختصر اور موثر بیٹریوں کے ڈیزائن پر کام کر رہا ہے۔ انسان اپنی ترقی کے اوج ثریا پہ پہنچ رہا ہے۔ سرن لیب بگ بینگ کی گتھی سلجھانے جا رہی ہے۔

اور دوسری طرف ہماری ترجیحات و مسائل تحقیق، تخلیق، ٹکنیک اور سائنس و ٹیکنالوجی نہیں بلکہ غیرت، حرمت، نسبت، مباشرت، لعنت، فقے، فتوے، حلالے، تبرّے، چندے، استنجے، ٹخنے، چلّے، بُتے، تکیے، دھاگے، کڑّے، گنڈے، کھیرے، لوٹے، لونڈے، حلوے، جلوے، تلوے، بکرے، کھوتے، متعہ، طوطے، پریاں، گدیاں، ٹوپیاں، جنتریاں، لونڈیاں، ہرا، کالا، نوری، سیندوری، دم، بم، مسلک، تلک، کھیر، تصویر، تقدیر، شلوار، تلوار، سنگسار، مقلد، غیر مقلد، مونچھ، داڑھی، جائز، ناجائز، مکروہ، بدعت، واجب، پورا ثواب، آدھی نیکی، پکا کافر، کچا مسلمان، کذاب، ثقہ، غیر ثقہ، دجالی، دلالی، حلالی، جلالی، جُنبی، لعنتی، جنتی، جہنمی!

یہ کیا مخبوط الحواسی ہے؟ کب تک یہ چورن بکے گا؟ کب تک یہ دیوانگی جاری رہے گی؟ بھائی! جتنا ستیاناس ہونا تھا ہو چکا۔ چلیں اب اس پر بات کرتے ہیں۔

کیا امریکہ و یورپ میں سائنس و ٹیکنالوجی پر کام پادری اور چرچ کر رہا ہے یا وہاں کی

یونیورسٹیاں، سائنسدان اور انجینئرز ؟ایک عجیب سا تقابل کیا جاتا ہے !ایک معاشرے کے سائنسدانوں اور انجینئرز کا دوسرے معاشرے کے مذہبی طبقے سے۔ہونا تو یہ چاہیے کہ یونیورسٹی کا تقابل یونیورسٹی سے ہو۔سائنسدانوں کا تقابل ہمارے سائنسدانوں سے ہو۔وہاں کے چرچ اور پادری کا تقابل یہاں کے اسلامی اداروں اور علماء وسکالرز سے ہو۔سوال یہ ہے کہ ہمارے ہاں کس عالم نے یونیورسٹیوں اور انجینئرز کو ایجادات سے روکا ہے؟

کیا یہاں دینی مدارس والے علمائے کرام لمز، یو ای ٹی، نسٹ اور فاسٹ والوں کو روکنے جاتے ہیں کہ آپ نے ایجادات نہیں کرنیں؟خبردار اگر کسی نے لیبارٹری میں کام کیا تو؟

جدید تعلیمی ادارے جہاں آپ کو دینی جھلک دور دور تک نظر نہیں آتی وہاں پر ریسرچ اور سائنس وٹیکنالوجی پر کام سے کس نے روکا ہے؟

چلیں مانا کہ مذہبی طبقہ انہی مشاغل میں مصروف ہے۔دراصل دینی ومعاشرتی معاملات میں اختلاف رائے ہوتا ہے، تشریحات کا فرق ہوتا ہے، ان کو کم ہونا چاہیے۔ دینی طبقہ ان معاملات پر مخالفت اور متشدد سوچ کو کافی حد تک کم بھی کر چکا ہے۔دعوت کے جدید اسلوب اور مسائل پر بات ہورہی ہے اور جدید ترین ٹیکنالوجی کا استعمال بھی۔دینی طبقے پر تو دھڑلے سے جو دل میں آیا کہہ دیا کہ وہ ان سرگرمیوں میں مصروف ہے لیکن ....ہمارا لبرل وسیکولر طبقہ کن سرگرمیوں میں مصروف ہے؟

اس ملک کا وہ طبقہ جس کے پاس وسائل کی بھرمار ہے۔اے اولیول کے ادارے، برٹش کونسل کے امتحانات، لمز، فاسٹ، اور ایسے ہی اعلیٰ ترین ادارے ہیں۔بیرونی سکالرشپس، بیرون ملک سے ڈگریاں، انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کی یونیورسٹیوں کے بھاری فنڈز۔ذرا حساب لگائیں کہ یہ ادارے کتنے فنڈز استعمال کرتے ہیں؟مدارس ومساجد کو تو سرکار چند ٹکے نہیں دیتی کہ انہیں اپنے خرچے پر چلایا جائے لیکن انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کی یونیورسٹیوں کو تو اربوں ملتے ہیں۔

یہ طبقہ کیا کارکردگی دکھا رہا ہے؟انہیں کس نے ایجادات اور ٹیکنالوجی میں پیش رفت سے روکا ہوا ہے؟

کتنی عجیب بات ہے کہ وسائل پر قبضے کے باوجود اس ملک کا ایلیٹ، لبرل وسیکولر طبقہ خود کچھ بھی کارکردگی دکھانے کی بجائے صرف ایسی ہی سطحی تحریروں کے ذریعے خود کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہے۔

جو مسائل گنوائے گئے ہیں۔جس طبقے پر الزام لگایا جاتا ہے ان کے پاس اس معاشرے کا کنٹرول کب ہے؟ ان کی وجہ سے معاشرہ زیادہ متاثر ہو رہا ہے یا پھر وسائل رکھنے والے اور بااختیار طبقہ کی وجہ سے؟

شائد ہم ذکر کرنا بھول گئے کہ اس طبقے کی بھی ترجیحات ہیں جو ایسی تحریریں پھیلاتا ہے۔ وہ اپنے وسائل اور وقت عیاشی میں لگاتے ہیں ۔ ان کی ترجیحات ہم جنس پرستی، میوزک، فلم سازی، ٹرانس جینڈر، شوبز، اور ایسی ہی عیاشیاں ہیں۔

بہر حال سوال تو ان سے ہونا چاہیے جو وسائل پر کنٹرول رکھتے ہیں، بھاری فنڈز کھاتے ہیں، بڑے ادارے بناتے ہیں اور سائنس وٹیکنالوجی میں ذرا سی بھی کارکردگی نہیں ہے ان کی؟ بات سائنس وٹیکنالوجی سے شروع ہوتی ہے لیکن آخر میں عورت مارچ کے فحش نعرے سامنے آتے ہیں۔ بات ایجادات کی کرتے ہیں اور تان ہم جنس پرستی کو تحفظ دینے پر ٹوٹتی ہے؟

مناسب تقابل یہ ہوتا کہ آپ بتاتے کہ ایک یورپین پادری نے سوال اٹھائے ہیں، اس نے اسلام پر اعتراضات کئے ہیں۔ اس نے وضاحت مانگی ہے لیکن مسلم سکالرز جواب نہیں دے پائے، وہ چھپتے پھر رہے ہیں، ان کے پاس دلائل نہیں ہیں اور وہ ڈائیلاگ سے بھاگ رہے ہیں پھر بات جچتی لیکن امریکہ و یورپ کے سائنسدانوں نے اگر کچھ ایجاد کیا ہے، انہوں نے نئی ٹیکنالوجی ڈویلپ کی ہے تو اس پر فکر مند اور شرمندہ تو ہمارے سائنسدانوں اور انجینئرز کو ہونا چاہیے کہ وہ اپنی فیلڈ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں، وہ کچھ نیا نہیں بنا سکے، وہ اپنی قوم و معاشرے کو ان وسائل کے عوض کچھ بھی نہیں دے سکے جو قوم نے انہیں فراہم کیے تھے۔

علماء اور دینی طبقات پر اعتراض کرنے والے شاید بھول جاتے ہیں کہ اگر معاشرتی، مذہبی، سماجی و تشریعی مسائل کا ہی تذکرہ کرنا ہے تو پھر مغرب کی صورت حال ہمارے ہاں سے بھی کہیں

بدتر ہے۔ یہ الگ تفصیلی موضوع ہے۔ آپ کو تذکرہ کرنا چاہیے تھا وہاں کتنے چھوٹے بڑے فرقے ہیں۔ ان کے آپس میں کیا اختلافات ہیں؟ وہاں خاندان کی کیا صورتحال ہے؟ وہاں کے معاشرتی مسائل کیا ہیں؟ وہاں کی کم سن بچیوں کو کن سے خطرہ ہے حقیقی والد اور بھائی سے؟ اُنہوں نے کہاں کہاں انسانیت کا خون کیا ہے؟ آپ کے ان ہیروز کے اسلحے و بارود سے کتنے لاکھ معصوم زندگیاں ختم ہوئی ہیں؟ انہوں نے محض تہذیب وثقافت کے اختلاف کی بنیاد پر کتنے ملک تباہ کیے ہیں؟ ان مہذب ہیروز کی معاشی پالیسیوں اور عالمی استعماری ہتھکنڈوں کی بدولت دنیا میں کس طرح غربت اور بھوک پھیل رہی ہے۔ غریب ممالک کو قرضوں اور قوانین کے جال میں پھنسا کر ان کے وسائل پر کس طرح قبضے کرتے ہیں؟

کیا یہ بڑے انسانی، اخلاقی اور مذہبی جرائم ہیں یا پھر ہمارے دینی طبقات میں جو فروعی اختلافات ہیں وہ بڑے جرائم ہیں؟ انسانیت کن سے زیادہ متاثر ہو رہی ہے اور کن کی وجہ سے تباہ ہو رہی ہے؟

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ہمارے دینی طبقے نے یورپ و مغربی دنیا کو اپنے دلائل سے متاثر بھی کیا ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کو پتہ نہ ہو لیکن لاکھوں امریکی و یورپین اسلام قبول کر چکے ہیں۔ بہت سے ممالک میں اسلام سب سے زیادہ قبول کیا جانے والا مذہب ہے اور یہ قبول اسلام انہی مولویوں اور دینی سکالرز کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ یہ کتب، یہ ویب سائٹس، مختلف زبانوں میں لٹریچر، یہ دینی طبقے نے ہی فراہم کیا ہے نہ کہ الحاد، لبرلزم اور سیکولرازم کا پرچار کرنے والے ہمارے مغرب زدہ طبقے نے۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے سائنسدانوں اور انجینئرز نے بھی کیا یورپ و امریکہ کو اپنی صلاحیتوں سے اتنا متاثر کیا ہے؟ کیا وہاں کے بڑے سائنسدان، ٹیکنالوجی کے ماہرین بھی ہمارے سائنسدانوں اور انجینئرز کو فالو کرتے ہیں؟ ان کا لٹریچر اور سائنسی تحقیق پڑھتے اور عمل کرتے ہیں؟ یعنی دینی طبقے نے تو اپنے میدان میں کچھ کر دکھایا ہے، اپنے میدان میں ہر سطح پر رہنمائی فراہم کی ہے لیکن سائنس و ٹیکنالوجی سے منسلک طبقہ اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں ناکام رہا ہے۔

چلیں حل ڈھونڈتے ہیں۔کوشش کرتے ہیں اور دینی طبقے کو سمجھاتے ہیں کہ باہم فروعی اختلافات کو مزید کم کریں،ان پر توجہ کم کی جائے۔جدید مسائل اور ضروریات پر زیادہ کام کیا جائے۔

لیکن دوسری طرف کو بھی تو سمجھانے کی ضرورت ہے۔صرف الزامات اور پروپیگنڈے پر مبنی تحریریں لکھنا تو کمال نہیں! ملک وقوم نے آپ کو وسائل دیئے ہیں،آپ ایلیٹ کلاس سے ہیں ۔آپ خوشحال ہیں،قوم کے ٹیکس کے پیسوں اور پرائیوٹ فنڈز سے آپ کو جدید ترین ادارے میسر ہیں۔آپ کو سہولیات ملتی ہیں۔وسائل اور اختیارات پر آپ کا کنٹرول ہے۔تو آیئے ذمہ داری کا احساس کیجیے۔ایجادات کیجئے۔نئی ٹیکنالوجی سامنے لائیں۔چاند پر کمند ڈالیں،چاہے سورج کو مسخر کریں۔ بلٹ ٹرین چلائیں یا پھر سپر سونک جہاز۔ففتھ جنریشن میں مہارت حاصل کریں۔ ڈیجیٹل ورلڈ میں چھا جائیں۔کس نے آپ کو روکا ہے۔؟

لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ وسائل اور سہولیات کو انجوائے کرنے کے بعد دینی لوگوں پر الزامی تحریریں لکھ کر بری الزمہ ہو جائیں کہ ہمیں تو کسی مولوی نے روک دیا تھا۔آپ اپنا فوکس ایجادات پر کریں۔نئی ٹیکنالوجی پر دھیان دیں۔کسی دینی بحث میں نہ الجھیں۔آپ ہرگز مسلک،تلک،کھیر،تصویر،تقدیر،شلوار،تلوار،سنگسار،مقلد،غیر مقلد،مونچھ،داڑھی کی بحث میں نہ پڑیں۔بس ایجادات اور ٹیکنالوجی پر توجہ دیں۔

یہ ہوگا درست تقابل۔ ہر طبقہ اپنی ذمہ داری لے۔ چرچ اور پادری کا تقابل اسلامی مراکز اور دینی سکالرز سے ہو جبکہ سائنس وٹیکنالوجی اور ایجادات کا تذکرہ کرتے وقت اسی میدان کے ماہرین کی کامیابی وناکامی کا تذکرہ کیا جائے۔اگر ایجادات نہیں ہو رہیں،ہم سائنس وٹیکنالوجی میں پیچھے رہ گئے ہیں تو اس کا جواب یونیورسٹیوں کے سائنس ڈپارٹمنٹ دیں۔ان مقاصد کے لیے قائم تحقیقی اداروں سے پوچھا جائے....نہ کہ مدارس وعلماء وسکالرز کو کٹھرے میں کھڑا کیا جائے۔ ہمارے لبرل وسیکولر طبقے کو ایجادات اور نئی ٹیکنالوجی سامنے لانا تو دور کم سے کم درست تقابل تو کرنا سیکھ لینا چاہیے۔

تعلیم و تربیت

مولانا سید سلیمان ندویؒ

ایک نئی طرز کا دینی مدرسہ

مولانا حمید الدین فراہی علماء کی گداگرانہ خصلت سے سخت نفرت کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مولویوں کے مدرسہ سے بھی گداگری کی لعنت دور ہو جائے۔ چنانچہ مدرسۃ الاصلاح کے لیے انہوں نے جائیداد خریدی جس کا سال بسال منافع آتا ہے اور صرف اپنی کوشش سے تمام عربی مدارس کے خلاف اس مدرسہ میں تجارتی و صنعتی آمدنیوں کے ذرائع پیدا کیے۔ خود اپنی طرف اور مدرسہ کے بعض مخلص ہمدردوں کی طرف سے کچھ سرمایہ لگا کر مدرسہ میں آٹا پیسنے کی مشین مع انجن کے لگائی اور اس سے مدرسہ کو روزانہ کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ مدرسہ کے اندر جوتا بنانے کا ایک شعبہ قائم کیا جہاں اچھے جوتے پمپ اور شوز وغیرہ بنتے ہیں۔ وہ حیدرآباد میں ایک اچھے منصب پر تھے۔ وہاں کے عمائد سے اچھی راہ ورسم تھی مگر اپنے مدرسہ کے لیے کبھی ریاست سے امداد کی تحریک نہیں کی۔ فرماتے تھے کہ بے اطمینانی ہی میں توکل کی دولت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق خاطر کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔

مدرسہ کی تعلیمی کیفیت یہ ہے کہ تمام مدرسین مولانا کے زہد و تقویٰ اور فضل و کمال سے ان کے گرویدہ تھے۔ سب سے پہلے مدرسین کو اپنا ہم خیال بنایا، اُن سے قرآن مجید کے مباحث اور علوم عالیہ کے مسائل میں اپنی تحقیقات بیان فرماتے رہتے تھے۔ ان کو اپنا طریقۂ تعلیم سمجھاتے اور بتاتے تھے۔ عربی میں صَرف ونحو کی تعلیم میں سب سے زیادہ وقت برباد ہوتا تھا، خود مولانا نے صَرف ونحو کے دو رسالے لکھے جن کا مدار تمام تر مشق پر ہے۔ وہ دونوں رسالے وہاں پڑھائے جاتے ہیں اور وہ کافی ہوتے ہیں۔ نصابِ تعلیم سے تمام غیر ضروری علوم نکال دیئے ہیں۔ قدیم منطق وفلسفہ کی ایک ایک دو دو کتابیں رہنے دی ہیں۔ ادبِ عربی پر خاص زور دیا۔ فقہ کا اصلی مرکز ومحور قرآن مجید کو رکھا گیا ہے۔

مولانا جب تک زندہ رہے، خود مدرسین اور اعلیٰ طلبہ کا ایک حلقہ بنا کر اس کو پورے قرآن مجید کا درس کئی دفعہ مختلف نقطہ ہائے نظر سے دیا۔ ساتھ ساتھ جدید فلسفہ کی بعض شاخیں بھی ان طلبہ کو پڑھائیں، چنانچہ بعض مستعد طلبہ نے مولانا کے اس درس سے پورا فائدہ اٹھایا جن میں قابل ذکر مولوی امین احسن صاحب اصلاحی ہیں۔ ہماری آئندہ توقعات ان سے بہت کچھ وابستہ ہیں۔ مولانا اخیر عمر میں تصنیف وتالیف کی بجائے اپنا تمام تر وقت انہی طلبہ کی غور و پرداخت اور تعلیم و تربیت پر صَرف فرماتے تھے اور انہیں اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے تھے۔ ('یادِ رفتگاں')

تعلیم و تربیت مدیر

عصرِ حاضر میں علوم کی اسلامی تشکیل (۲)

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی اور ڈاکٹر محمد رفعت کی آراء کا محاکمہ

اسلامی فلسفۂ علم میں مقاصدِ علم

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب کے سارے نکات غلط فکری، غلط فہمی اور مغالطوں کا پلندہ ہیں اور علم و تعلیم کے حوالے سے مغرب پرستی اور اسلامی علمیت سے ناواقفیت کا مظہر ہیں۔ وہ ناواقفوں کے لیے بلاشبہ گمراہی کا سبب ہیں۔ اب اس موضوع پر بات چل ہی نکلی ہے تو ہم ان کے ایک ایک نکتے کا تجزیہ اور رد کریں گے، ان شاء اللہ۔ فی الحال یہ بحث جاری ہے کہ اسلام کا فلسفۂ علم کیا ہے؟ جن میں علم کی اقسام کا ذکر ہو چکا اور یہ بات سامنے آ چکی کہ ڈاکٹر صاحب پر یہ واضح ہی نہیں کہ کس قسم کے علم میں اضافے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے کن صفات کی ضرورت ہے؟ اب ہم یہ بات سامنے لائیں گے کہ اسلامی فلسفۂ علم میں مقاصدِ علم کیا ہیں؟

سورہ بقرہ میں تخلیقِ آدم کا قصہ اس سلسلے میں ہماری رہنمائی فرماتا ہے جو آیت ۲۹ سے ۳۹ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس نے انسان کو دو طرح کے علوم سے نوازا ہے۔ ایک دنیا میں زندگی گزارنے کا علم جسے اللہ تعالیٰ نے ”وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا“ [البقرہ ۲:۳۱] سے تعبیر کیا ہے اور دوسرا علم ہدایت جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس قصے کے اختتام پر کیا ہے۔ چونکہ یہ اس باب میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے اور دو مختصر آیات پر مبنی ہے لہٰذا ان کے متن کا مطالعہ بسہولت کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ [البقرہ ۲:۳۸،۳۹]

یعنی ”ہم نے کہا تم سب اترو یہاں سے (اور نکلو جنت سے)۔ پھر جب تمہارے پاس میری ہدایت پہنچے گی تو جس نے اس ہدایت کی پیروی کی اسے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ غم اور جس نے اس کا انکا

رکیا اور ہماری آیات (کتاب اللہ) اور نشانیوں کو جھٹلایا تو وہی جہنمی ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

ان دونوں طرح کے علوم سے متعلق آیات کو ملا کر پڑھیے تو آپ پر واضح ہوجائے گا کہ انسان کے پاس دنیا گزارنے کا جو علم ہے وہ اس کی ذاتی تحصیل نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے اور دوسری بات یہ کہ جو آدمی دنیا گزارنے کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق سرانجام دے گا، اسے کوئی خوف اور غم نہیں ہوگا۔ وہ دنیا میں اطمینان بھری زندگی گزارے گا اور آخرت میں بھی کامیاب ہوگا اور جو اس ہدایت کا انکار کرے گا جو اللہ کی نازل کردہ کتابوں میں موجود ہے اور انفس و آفاق میں اس کی نشانیاں بھی موجود ہیں (اس سے بالواسطہ یہ بات بھی نکلی کہ انفس و آفاق کا مطالعہ اور اس کی تسخیر کا صرف وہ منہج صحیح ہے جو اسے اللہ تک اور اس کی ہدایت تک لے جائے) تو وہ دنیا میں میں خوف و غم کی زندگی گزارے گا (کیونکہ خوف و غم نہ ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی پیروی سے مشروط ہے) اور آخرت میں جہنم کی سزا بھگتے گا اور اس میں ہمیشہ رہے گا۔

اب ڈاکٹر صدیقی صاحب ہمیں بتائیں کہ کیا مغرب کا علم (ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم، میٹریل ازم اور ایمپریسزم سے حاصل کردہ علم) اللہ اور اس کی ہدایت کا اثبات کرتا ہے اور اس کے اتباع پر ابھارتا ہے؟ اور کیا مغرب کا دنیا کی زندگی گزارنے کا علم اور تسخیر کائنات کا منہج (یعنی ان کی سوشل سائنسز اور سائنس و ٹیکنالوجی) کیا اللہ تک اور اس کی ہدایت کو قبول کرنے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے تک لے جاتا ہے؟ اور کیا ان کی زندگی خوف و اضطراب اور غم سے پاک ہے؟ ظاہر ہے کہ ان تینوں باتوں کا جواب نفی میں ہے اِلّا یہ کہ کوئی آدمی صریح جھوٹ بولنے پر تل جائے۔

اسلامی فلسفہءعلم۔علم کا قطعی و ظنّی ہونا

ڈاکٹر صدیقی صاحب فرماتے ہیں کہ 'انسانی معلومات کا ایک بڑا حصہ ظنّی ہوتا ہے اور اس میں ابہام پایا جاتا ہے اور یہ کہ انسان کی صلاحیت محدود ہے، وہ سب کچھ نہیں جان سکتا اور انسانی علم کا ہر جزو یکساں قطعیت کا حامل نہیں ہوسکتا چنانچہ قطعیت کا دعویٰ کرنے کی بجائے علم کی جستجو کرنے والوں کے لیے انکسار کا رویہ زیادہ مناسب ہے۔'

ڈاکٹر صاحب کی یہ بات بھی اسلامی فلسفہ علم سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں عرض کیا کہ علم وحی یعنی قرآن و سنت کا علم قطعی اور حتمی ہے۔ قرآن تو اپنی ابتداء ہی اس

دعوے سے کرتا ہے کہ اس کا علمی قطعی اور حتمی ہے، ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے اور وہ ہدایت کا منبع ہے چنانچہ فرمایا "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" "البقرہ ۲:۲) اللہ کے رسول ﷺ کی سنت بھی قطعی ہے کیونکہ خود خدا اس کے سچا ہونے کی گواہی دیتا ہے چنانچہ فرمایا:

"وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝" [النجم ۵۳: ۳، ۴]

اور وحی آپ ﷺ کی تصویب کے لیے موجود تھی اور قرآن کے ساتھ آپ ﷺ کی سنت کی حفاظت کے لیے مسلمانوں نے روایت ودرایت اور علم جرح وتعدیل اور علم اسماء الرجال کی صورت میں دنیا کا عظیم ریسرچ نیٹ ورک اس وقت قائم کیا جب مغرب کو ریسرچ کے معنی بھی نہ آتے تھے۔ اسی طرح اسلام میں عمرانی علوم کا پچاس فیصد علم وحی پر مبنی ہوتا ہے اور باقی پچاس فیصد جو اجتہاد پر مبنی ہے، اس میں مسلمانوں نے اجتماعی اجتہاد اور اجماع کی صورت میں اس کے تقریباً یقینی ہونے کی صورت پیدا کرلی۔ اس کے مقابلے میں مغرب کا علم چونکہ وحی کی سند سے محروم ہے لہٰذا اس کی ابتداء ہی تشکیک (Skepticism) سے ہوتی ہے اور اسے کچھ سہارا اس وقت ملتا ہے جب مشاہدہ اور تجربہ اس کی تصدیق کرے۔ اور مشاہدہ وتجربہ جس کی تصدیق نہ کرے مغرب اسے علم ہی ماننے سے انکار کردیتا ہے۔ اور پھر مشاہدہ وتجربہ کے نتائج بھی چونکہ بدلتے رہتے ہیں جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ سائنسی نظریات میں ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا مغرب تو مجبور ہے کہ وہ قطعی علم کی موجودگی کا انکار کرے لیکن ہمارے ڈاکٹر صدیقی صاحب کیوں ہمیں اللہ ورسول کے عطا کردہ علم قطعی اور اس پر یقین وایمان سے محروم کرنا چاہتے ہیں؟ جبکہ علم اجتہادی بھی اگر اجتماعی اجتہاد یا اجماع کی صورت میں ہو تو قریب بالیقین ہوجاتا ہے تو اسے کیوں مشکوک ٹھہرایا جائے؟

مغربی علوم اور اخلاق

ڈاکٹر صاحب اس ضمن میں فرماتے ہیں: "علوم کی اسلامی تدوین پر گفتگو کرتے ہوئے دو طرح کے کاموں میں فرق کیا جانا چاہیے، اگرچہ دونوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ان میں سے ایک کام موجود علمی سرمائے کا مفید استعمال ہے۔ یہاں اصل اہمیت اس امر کی ہے کہ معلومات کا استعمال اخلاقی قدروں کے تابع اور اخلاقی حدود کا پابند ہو۔ اس کام کے کرنے کے لیے اخلاقی اقدار کا شعور اور انسانی زندگی سے ان کے ربط کی دریافت وشناخت ضروری ہے۔"

ڈاکٹر صاحب ہمیں بتائیں گے کہ اگر اخلاق کا منبع عقیدہ نہ ہو تو اس کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے اور وہ کیونکہ اضافیت (Relativisim) سے بچ سکتا ہے؟ مثلاً کیا ڈاکٹر صاحب مغرب کے 'تجارتی اخلاق' (Business Ethics) کی اسلامی نقطہ نظر سے حمایت کرنا پسند فرمائیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی قدریں اسی وقت اہم ہوتی ہیں اور آفاقی ہوتی ہیں جب ان کا منبع عقیدہ اور دین/ مذہب ہو۔ اگر آپ اخلاقی اقدار کو دینی استناد سے محروم کر دیں تو وہ وقعت و اہمیت کھودیں گی اور آفاقی نہیں رہیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ کئی مغربی فلاسفر اخلاقی اقدار کے استقلال اور ان کے آفاقی ہونے کے قائل ہی نہیں۔ ان حالات میں ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ مغرب کے پیدا کردہ علم سے فائدہ اٹھایا جائے بشرطیکہ وہ اخلاقی اقدار سے ہم آہنگ ہو؟ یہ ناممکن الوقوع ہے کیونکہ مغربی مفکرین اللہ اور مذہب کی بالادستی قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں اور اخلاقی اقدار اگر دینی استناد سے محروم ہوں تو وہ بے وقعت ہوں گی۔

علوم کی آفاقیت

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب فرماتے ہیں کہ ''علم کے دائرے کو وسیع کرنے کا کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے آفاقی ہے، یعنی اس کام کی انجام دہی میں انسانیت کے مختلف گروہوں کا باہمی تعاون ممکن بھی ہے اور ضروری بھی۔ دین اور عقیدے کا اختلاف یا اخلاقی نقطۂ نظر کا اختلاف اس تعاون میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔''

ہم حیران ہیں کہ ڈاکٹر صاحب مغرب کے پیدا کردہ علم کو اور اس علم میں اضافے کو آفاقی کہہ رہے ہیں۔

مغرب کا پیدا کردہ علم ہرگز آفاقی نہیں ہے۔ یہ علم مغرب کے بنیادی عقائد (ہیومنزم، سیکولرازم، لبرل ازم، کیپٹل ازم، میٹریلزم، ایمپیریسزم وغیرہ) پر مبنی ہے جو اسلام مذہب/ دین کی ضد ہیں۔ ان عقائد سے بننے والا ورلڈ ویو سو فیصد اسلام مخالف ہے کیونکہ وہ توحید، رسالت اور آخرت کا منکر ہے۔ اسی طرح مغرب کا فلسفۂ علم سو فیصد اسلام کے فلسفۂ علم کا نقیض ہے کیونکہ وہ وحی کو منبعِ علم تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ عقل اور مشاہدے و تجربے کو علم کی واحد اساس قرار دیتا ہے جبکہ اسلامی فلسفۂ علم میں عقل و تجربے کی حیثیت ثانوی ہے اور وہ وحی کے تابع ہے۔ لہٰذا مغربی علوم آفاقی کیسے ہو سکتے ہیں؟ اور مسلمان کیونکہ ایسے علم کو قبول کر سکتے ہیں؟ بلاشبہ مغربی فکر و تہذیب کے علم بردار ممالک اپنی فکر و تہذیب کی یونیورسلائزیشن اور گلوبلائزیشن کے مدعی ہیں اور اس کے

لیے کوششیں بھی کر رہے ہیں اور اس مقصد سے اقوام متحدہ کے ادارے کو بھی استعمال کر رہے ہیں لیکن یہ سب کچھ مغرب اپنے سیاسی، حربی، معاشی اور تہذیبی غلبے کی وجہ سے کر رہا ہے اور مسلمان اور تیسری دنیا کی قومیں اسے جبر سمجھتی ہیں۔ابھی کچھ دن پہلے (۲۴ دسمبر ۲۰۲۱ء) کی خبر تھی کہ سعودی عرب نے جنرل اسمبلی کے پاس کردہ خواتین حقوق کے چارٹر (CEDAW) کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے کیونکہ اس کی متعدد دفعات اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں۔یہی حال مغرب کے سیاسی اور معاشی نظام، اس کے معاشرتی اور ثقافتی پیکیج اور اس کے وضع کردہ علوم کا ہے کہ ان سب پر مغرب کے الحاد اور دہریت کا ٹھپہ ہے اور کوئی مسلمان انہیں قبول نہیں کر سکتا۔اگر چند مغرب زدہ مسلم دانشور اور مسلم حکمران ان کو قبول کر رہے ہیں تو یہ مغربی استعمار کے جبر و تسلط اور فکری و تہذیبی غلبے کی وجہ سے ہے نہ کہ اس وجہ سے کہ مغرب کا پیغام میرٹ پر آفاقی ہے۔مغرب کا پیغام ہرگز میرٹ پر آفاقی نہیں ہے، مسلمانوں کے نزدیک یہ کفر، الحاد اور زندقہ پر مبنی ہے، خلافِ اسلام ہے اور قابل ردّ ہے۔لہٰذا ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب کا مغربی علوم کو آفاقی قرار دینا بالکل غلط اور ناقابل قبول ہے۔

ان کی اس بات میں بھی کوئی وزن نہیں کہ علوم کو آفاقی بنانے کے لیے دین اور عقیدے کا اختلاف یا اخلاقی نقطہ نظر کا اختلاف مسلمانوں کے مغرب سے علمی تعاون میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے کیونکہ مغربی علوم کی اساس ہی وحی کے رد پر ہے۔مغربی تہذیب کے بنیادی عقائد اور اس کا ورلڈ ویو اسلام کے بنیادی عقائد اور اسلام کے ورلڈ ویو (توحید، رسالت، آخرت) کی ضد ہے اور ان سے متضاد ہے۔لہٰذا مغربی ورلڈ ویڈ کے تحت پیدا کردہ علوم مسلمانوں کے لیے کیسے قابل قبول ہو سکتے ہیں؟

ہم مغرب زدہ دانشوروں کو اسی لیے متجددین کہتے ہیں کہ وہ مغرب کے الحادی افکار و علوم کو خوبصورت، معصوم اور مفید کہہ کر پیش کرتے ہیں تاکہ مسلمان انہیں قبول کر لیں۔ وہ انہیں عین اسلامی بنا کر پیش کرتے ہیں اور اسلامی تعلیمات اور علوم کی ایسی تشریح کرتے ہیں کہ وہ مغربی افکار و علوم کے مطابق لگیں۔مسلمان اہل علم اب ان متجددین (مستشرقین و مستغربین) کے اسلوب اور سازشوں کو سمجھنے لگے ہیں اور وہ ان کے دام تزویر میں نہیں آئیں گے، ان شاءاللہ۔

قرآن خود ہماری رہنمائی فرماتا ہے کہ انسانیت دو گروہوں میں منقسم ہے۔ایک حزب اللہ اور دوسری حزب الشیطان [1]۔ایک مسلم جو اللہ اور اس کی ہدایت کو ماننے والی ہے اور دوسری کافر

---

[1] المائدہ ۵:۵۶، الکہف ۱۸:۱۲، المجادلہ ۵۸:۱۹

جو اللہ اور اس کی ہدایت کا انکار کرتی ہے۔ قرآن مشرکین کو اور ان اہل کتاب کو جو نبی کریم ﷺ کی نبوت کو اور قرآن کو ہدایت تسلیم نہیں کرتے، کھلم کھلا اور بار بار کافر کہتا ہے۔[۱] اور یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے دشمن ہیں، ان کے بدخواہ ہیں اور ان سے نفرت کرتے ہیں۔[۲] مغرب کو مسلمانوں کے لیے قابل تقلید اور قابل قبول قرار دینے والے متجددین ان آیات سے کیسے صرفِ نظر کر سکتے ہیں؟ وہ اس بات کو کیسے بھول سکتے ہیں کہ مغربی استعمار نے مسلمان ملکوں کو کچلا، لوٹا، تباہ و برباد کیا، انہیں غلام بنایا اور ہمیشہ کے لیے انہیں غلام رکھنے کی منصوبہ بندی کی اور ان کے اجتماعی اداروں کو منہدم کر کے انہیں مغربی فکر و تہذیب کی بنیادوں پر استوار کیا اور آج بھی وہ عراق، افغانستان اور لیبیا جیسے مسلم ممالک کو فتح کر کے تباہ و برباد کر چکے۔ شام اور یمن تباہ کیے جا رہے ہیں اور پاکستان و ایران شدید دباؤ میں ہیں۔ اس سب کے باوجود یہ مغرب گزیدہ دانشور مسلمانوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ مغربی علوم کو اپنا لو، اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ اسی میں ترقی ہے، اسی میں بھلائی ہے۔

ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو علم اور تعلیم میں پیش رفت کی ضرورت ہے لیکن یہ ناگزیر ہے کہ علوم اور تعلیم میں یہ پیشرفت سو فیصد اسلامی تناظر میں ہو۔ مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کو رد کر دیا جائے اور قرآن و سنت کی روشنی میں، پچھلے چودہ سو سال کے امت کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے اور آج کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اجتہادی نقطہ نظر سے علوم و تعلیم کی تدوین نو کی جائے، نہ کہ ان امور میں مغربی فکر و تہذیب کی پیروی کی جائے۔ یاد رکھیے مغربی فکر و تہذیب مسلمانوں کے لیے داء ہے دوا نہیں۔ مغربی فکر و تہذیب کی پیروی مسلمانوں کو دین سے دور کرے گی اور مسلمان مزید قعرِ ذلت میں ڈوبتے چلے جائیں گے اور زوال سے نکل نہیں سکیں گے۔ مسلمانوں کے زوال سے نکلنے کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ سچ مچ کے مسلمان بن جائیں۔ علوم اور تعلیم کا نظام ایسا ہو کہ وہ ان کے اندر ایمان کی آبیاری کرے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کر کے انہیں اسلام پر عمل کے لیے ابھارے۔ یہ تعمیرِ فرد کا قرآنی فارمولا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو دیا۔ اس سے انکار ممکن ہی نہیں۔

---

[۱] البینہ ۹۸:۱،۶

[۲] آل عمران ۳:۱۱۹

ڈاکٹرمحمدرفعت کی آراء

ڈاکٹرنجات اللہ صدیقی صاحب کے موقف کے اس تجزیے کے بعد آیئے اب دیکھیں کہ ڈاکٹرمحمدرفعت صاحب نے ڈاکٹرنجات اللہ صدیقی صاحب کے موقف کا تجزیہ کیسے کیا ہے؟ وہ فرماتے ہیں کہ ڈاکٹرنجات اللہ صدیقی صاحب کا ''پورا مقالہ دلچسپ اورفکرانگیز ہے''۔ وہ ڈاکٹر صدیقی صاحب کے طے کردہ منہج (یعنی مغربی فکروتہذیب سے مرعوبیت اوراسلام کا متجددانہ اور مغلوبانہ موقف پیش کرنا) کوتسلیم کرتے ہیں اورانہی کی لَے کوآگے بڑھاتے ہیں لیکن نام مولانا مودودیؒ کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے موقف کو تین عناوین سے زیربحث لائے ہیں: ا۔آفاقیت ۲۔امامت وقیادت ۳۔تخلیقیت

آفاقیت

ڈاکٹررفعت صاحب کہتے ہیں کہ علوم کا مغربی نقطۂ نظرآفاقی ہونے کادعویٰ کرتا ہےاورڈاکٹر صدیقی صاحب کے ''اس خیال سے اتفاق کیا جانا چاہیے کہ علم کے دائرے میں توسیع کاعمل آفاقی نوعیت رکھتا ہے چنانچہ اس کام کو امت مسلمہ تک محدود سمجھنے یا محدود رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے''۔ چنانچہ پہلے وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ''وہ آفاقی تصورکائنات کیا ہے جس پرتحقیق کرنے والے باہم اتفاق کرسکیں اوروہ اقدارکون سی ہیں جن کووہ سب تسلیم کرلیں''۔ پھروہ اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ اس کا حل یہ ہے کہ 'معروف ومنکر'(یامعروفات ومنکرات) کےتصورکواپنالیا جائے۔ وہ فرماتے ہیں ''مطلوب انسانی رویہ وہ ہے جومعروف کی تعریف پرپورااترتا ہے۔ اسی طرح منکرایسا رویہ ہے جو ناپسندیدہ اور نامطلوب ہے''۔ وہ مزید فرماتے ہیں کہ ''اسلام نے اخلاقی قدروں کے ضمن میں اپنے نقطہ نظرکو بیان کرنے کے لیے معروف اورمنکر کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ یہ اصطلاحیں آفاقی مفہوم کی حامل ہیں۔'' مزید فرماتے ہیں ''انسانوں میں عقیدے کے اختلاف کے باوجوداخلاقی اقدار کے سلسلے میں ان کا متحدالخیال ہوناممکن ہے اور باہمی تعامل کے لیےضروری بھی ہے۔ معروف ومنکر کےتصورات اس اتحاد کی بنیاد ہیں۔''

وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں اوراہل مغرب کےمعروف ومنکر پراتحاد کے لیےان کا اسلام قبول کرنا شرط نہیں ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اسلام نے اخلاقی قدروں کے ضمن میں اپنے نقطۂ نظرکو

بیان کرنے کے لیے معروف ومنکر کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ یہ اصطلاحیں آفاقی مفہوم کی حامل ہیں۔ جو افراد اسلام کو بحیثیت دین قبول نہ کریں ان کو بھی معروف کی طرف بلانا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ مزید فرماتے ہیں ''توحید پر مبنی اس تصور کو تمام انسان اپنا سکتے ہیں اور اس بنیاد پر علمی سرگرمیوں کو منظم کر سکتے ہیں۔ اسلام سے باقاعدہ وابستگی اس کے لیے لازمی شرط نہیں ہے۔''

ڈاکٹر رفعت صاحب کی یہ باتیں قرآن وسنت اور مسلمانوں کے مجمع علیہ فہم دین کے خلاف ہیں۔

سارا قرآن اس سے بھرا پڑا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو اور پیغمبر کو لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا ہے۔ جو افراد اللہ، رسول، آخرت کو مانیں وہ مسلم ہیں اور جو نہ مانیں وہ کافر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان اہل کتاب کو جو حضرت محمد ﷺ کی رسالت کو اور ان پر نازل کی گئی کتاب کو نہیں مانتے، انہیں برملا اور کئی دفعہ قرآن میں 'کافر' کہا ہے یعنی وہ منکرین حق ہیں۔ دنیا میں انہیں یا تو اسلام کو قبول کرنا ہے یا اس کی بالادستی کو تسلیم کرنا ہے اور آخرت میں وہ جہنم کے عذاب کے مستحق ہوں گے۔ اور موجودہ مغربی معاشرہ کے اکثر افراد تو کب کے یہودیت ونصرانیت کو بھی خیر باد کہہ چکے اور ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم اور ایمپریسزم جیسے نظریات انہیں الحاد، بے دینی اور زندیقیت کی طرف دھکیل چکے ہیں۔ ڈاکٹر رفعت صاحب کے ممدوح مولانا مودودیؒ مغربی فکر وتہذیب کو 'جاہلیت خالصہ' سے تعبیر کرتے ہیں جو اہل کتاب ہونا تو درکنار جاہلیت قدیمہ سے بھی بدتر ہے۔ ڈاکٹر رفعت صاحب موجودہ علمی سرمائے میں اضافے کے لیے (کس طرح کے اور کس قسم کے علم میں اضافے کے لیے؟) اور علم کو آفاقی بنانے کے لیے مغرب سے جو علمی تعاون کرنا چاہتے ہیں تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا اسلام 'فطری' اور 'آفاقی' دین نہیں ہے؟ قرآن تو اسلام کو آفاقی [۱] اور فطری [۲] دین کہتا ہے؟ تو پھر ڈاکٹر رفعت صاحب کو قرآن وسنت کے اوامر ونواہی کے علاوہ کس آفاقیت کی تلاش ہے؟

ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر رفعت صاحب کو ایسی آفاقیت کی تلاش ہے جو مغربی فکر وتہذیب کے خلاف نہ ہو، جو انہیں غیر مسلم اور کافر نہ کہے۔ جو مغرب کے نقطۂ نظر اور ان کے علم کو رد نہ کرے، جو مغربی فکر وتہذیب کی مخالف نہ ہو، جو اس سے متضاد نہ ہو بلکہ وہ ایسی آفاقیت ہو جو مغربی فکر وتہذیب کے ساتھ ایڈجسٹ کر سکے، اس کے ساتھ توافق اور مفاہمت کے ساتھ چل

---

[۱] سبا ۳۴: ۲۸

[۲] الروم ۳۰: ۳۰

سکے۔اس کے لیے انہیں جوحل نظر آیا ہے وہ یہ ہے کہ دین اوراس کے احکام کی بجائے 'معروفات' پرعمل کیا جائے؟ ہم ڈاکٹر صاحب موصوف کے بارے میں تفصیل سے نہیں جانتے کہ انہوں نے دین کا کتنا گہرا مطالعہ کیا ہے تاہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ اگر انہوں نے اسلام میں عرف کی حیثیت کے بارے میں کچھ پڑھا ہے تو انہیں اندازہ ہوگا کہ عرف وہ چیز ہے جسے انگریزی میں Customs and Usages کہا جاتا ہے یعنی معاشرے میں مروج رسوم ورواج۔ان کے بارے میں علماء نے ہمیشہ یہ شرط رکھی ہے کہ صرف وہ عرف قابل قبول ہے جو احکام شریعت کے مطابق ہو، اس کے خلاف نہ ہو بلکہ اس کے مقاصد کو پورا کرنے والا ہو۔گویا وہ عرف نا قابل قبول ہے جو احکام شریعت کے خلاف ہو یا مقاصد شریعت کی نفی کرتا ہو۔تفصیل کے لیے دیکھیے ابن عابدین شامی کا ''نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف''۔

پھر ڈاکٹر رفعت صاحب کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ:

قرآن حکیم میں معروف کا حکم اکثر معاشرتی امور میں دیا گیا ہے اور وہ بھی متعین احکام دینے کے بعد۔ چند مثالیں دیکھیے۔

- قصاص کا حکم دینے کے بعد فرمایا کہ اگر مقتول کے ورثاء معاف کردیں تو معروف یعنی بھلے طریقے سے اس کا اتباع کرو(البقرہ ۲:۱۷۸)

- طلاق کے احکام دینے کے بعد فرمایا کہ "فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ"[البقرہ ۲:۲۳۱]

- نکاح اور احصان وعفت کے قوانین بتانے کے بعد فرمایا"وَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ"[النساء ۴:۲۵]

- اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس پیغمبر کا اتباع کرو جو تم پر حلال وحرام واضح کرتا ہے اور"يَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهٰهُمۡ عَنِ الۡمُنۡكَرِ"[الاعراف ۷:۱۵۷]

- اللہ تعالیٰ نے فرمایا مومن وہ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، اللہ ورسول کی اطاعت کرتے ہیں اور معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہیں(التوبہ ۹:۷۱)

- ڈاکٹر رفعت صاحب نے "وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ

بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ "[آل عمران ۳:۱۰۴] کا جو حوالہ دیا ہے وہ ذرا اس سے پہلے اور بعد کی آیات پڑھ کر دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ مجھ سے ڈرو اور تمہیں موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم مسلم ہو۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ پھر فرمایا کہ تم میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو نیکی کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور جو اللہ کی واضح نشانیاں آجانے کے بعد بھی کفر کا رویہ اختیار کریں وہ عذاب عظیم کے مستحق ہوں گے اور آخرت میں ان کے چہرے سیاہ ہوں گے (آل عمران ۳:۱۰۱،۱۰۷)

اسی طرح "كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" والی جس آیت کا ڈاکٹر رفعت صاحب نے ذکر کیا ہے وہ اس کی پوری آیت پڑھیں۔ آدھی پڑھ کر نہ چھوڑ دیں۔ وہاں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں (ترجمہ ڈاکٹر صاحب کے ممدوح سید مودودیؒ کا ہے) ''کہ اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہل کتاب ایمان لاتے انہی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایماندار بھی ہیں مگر ان کے بیشتر افراد فاسق (نافرمان) ہیں'' (آل عمران ۳:۱۱۰)

اب ڈاکٹر صاحب انصاف سے بتائیں کہ کیا ان آیات سے معروف ومنکر کا کوئی ایسا تصور نکلتا ہے جو اسلامی احکام سے ماوراء ہو۔ جو قرآن وسنت کے اوامر ونواہی سے الگ کوئی ایسی نرم چیز ہو جو کفار اور مسلمان کے درمیان مشترک ہو سکتی ہو۔ کیا معروف ومنکر کے ذکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن وسنت کی ہدایت کو نہ ماننے والوں کو کافر اور فاسق نہیں کہا؟ انہیں جہنمی نہیں کہا؟ تو پھر ڈاکٹر رفعت صاحب کیسے کہتے ہیں کہ عقیدہ کو چھوڑ کر معروف ومنکر کے تصور کے تحت اہل مغرب کے کفار اور زنادقہ کے ساتھ مل کر 'علمی سرمائے میں اضافہ' کی مشترکہ جدوجہد کی جا سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل مغرب کے انسانی وسماجی علوم ان کے کفر وفسق سے بھرے ہوئے ہیں اور ان کی سائنس وٹیکنالوجی ایسے آلات اور ایسی سہولیات مہیا کر رہی ہے جو کافرانہ زندگی گزارنے میں ممد ومعاون ہیں اور اسلامی زندگی گزارنے کو ناممکن بنا رہی ہیں۔ اس لیے اس کفر وفسق سے سو بار الحذر۔ مسلم اہل علم کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اسلام اور اسلامی فلسفۂ علم کی اساس پر عمرانی وسائنسی علوم کی تشکیلِ نو اور تدوینِ نو کریں اور بس۔ (جاری ہے)

تزکیۂ نفس

مولانا سید مختار الدین شاہ[1]

تحریکِ ایمان وتقویٰ - ایک تعارف

[دیکھیے البرہان کا تبصرہ مضمون کے آخر میں]

''تحریک ایمان وتقویٰ'' کے نام سے جو محنت ہو رہی ہے اس کے بنیادی مقاصد تین ہیں:

۱۔ تزکیۂ نفس ۲۔ پورے دین پر عمل ۳۔ اتحادِ امت

تزکیۂ نفس

تزکیۂ نفس کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا جو ایمان وتقویٰ پر قائم رہنے اور ترقی کا سبب ہے۔ 'تزکیۂ نفس' کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا دل شرک، نفاق، ریاکاری، تکبر، حسد، بخل وغیرہ سے پاک ہو اور اخلاص، تواضع وانکساری، شکرگزاری، اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر مہربانی، سچائی اور امانت جیسی صفات سے آراستہ اور مزین ہو۔ اور فلاح اسی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا﴾ ''بے شک وہ کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کو پاک کیا'' (الشمس: ۹)

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ ''یقیناً کامیاب ہوا وہ جس نے پاکیزگی حاصل کی'' (الاعلیٰ: ۱۴)

اسی طرح کئی آیتوں اور حدیثوں میں اس کو فلاح ونجات کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اور قرآن پاک نے چار جگہ اسی کو انبیاء علیہم السلام خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض اور کاموں میں سے ایک اہم فریضہ اور کام بتایا ہے مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ [الجمعہ ۶۲:۲]

---

[1] بانی تحریک، خانقاہ کربوغہ شریف، ضلع ہنگو، خیبر پی کے۔ شاہ صاحب مولانا ذکریا کاندھلویؒ کے خلیفۂ مجاز اور دارالعلوم کورنگی، کراچی کے فارغ التحصیل ہیں۔

''وہی ہے جس نے ان امیوں میں ایک (عظیم) رسول انہی میں سے بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے، ان کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور بے شک وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں (پڑے ہوئے) تھے''۔

حصولِ تزکیہ کے بنیادی اصول: ضروری علم، مجاہدۂ نفس، کثرتِ ذکر اور صحبتِ صالح۔ تزکیہ کے حصول کے اسی طریقے کا نام تصوف ہے، اسی کو احسان وسلوک بھی کہا جاتا ہے اور اسی کو راہِ تزکیہ یا راہِ تقویٰ کہنا بھی درست ہے۔

پورے دین پر عمل کرنا

یعنی امت کو پورے دین پر عمل کرنے کے لیے متوجہ کرنا۔ پچھلی کتابی قومیں دنیا بھر میں اسی لیے ذلیل ہوئی تھیں اور دنیا وآخرت دونوں کے اعتبار سے تباہ وبرباد ہوگئی تھیں کہ انہوں نے من پسند اور اس دین کو تو اختیار کیا تھا جو ان کے لیے آسان تھا یا جس کی وجہ سے ان کی دینداری کی شہرت ہوتی تھی اور جہاں ان کے دنیاوی مفادات پر زد پڑتی تھی وہ ان کی زندگی سے نکل گیا تھا۔ اس کی وجہ ان کی دنیا پرستی اور مفاد پرستی تھی۔ اہل کتاب کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۡ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝﴾[البقرہ۲:۸۵،۸۶]

''کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو، لہٰذا جو تم (اہل کتاب) میں سے ایسا کرے ان کی یہی سزا ہے کہ دنیا میں ذلیل ہو اور قیامت کے دن بھی وہ سخت عذاب میں دھکیلے جائیں گے۔ اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کیا کرتے ہو(۸۵) یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے خرید ا، لہٰذا (ان کو سخت عذاب ہوگا اور) ان سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا اور نہ ان کو کوئی مدد مل سکے گی۔'' (البقرۃ:۸۵،۸۶)

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس امت پر انعام فرما کر دوسرے لوگوں کے لیے منتخب فرماتا ہے جب وہ بگڑ جائے اور نفسانی خواہشات کی پیروکار بن جائے تو ایسے لوگ حقیقی معنوں میں دین

کا نقشہ لوگوں کے سامنے پیش نہیں کر سکتے، بلکہ ان کو دیکھ کر لوگ دین حق سے متنفر ہو جاتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ ان پر دوسری قوموں کو مسلط کرتے ہیں تاکہ وہ ان کی پٹائی کر کے دنیا میں بھی ان کو پوری طرح ذلیل کر دیں۔

اسی لیے پچھلی امتوں کی تاریخ کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے سامنے رکھ کر انہیں ہدایت کی ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ [البقرہ۲:۲۰۸]

''اے ایمان والو! اسلام میں سارے کے سارے (اور پورے کے پورے) داخل ہو جاؤ اور (زندگی کی کسی لائن اور شعبے میں بھی) شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

پورا دین کیا ہے؟

۱۔ ایمانیات وعقائد

۲۔ اسلام کے ظاہری اعمال مثلاً عبادات، صفائی معاملات، فرائض، بندوں کے حقوق کی ادائیگی۔

۳۔ احسان یا حسنِ اخلاق یا تزکیہ اور ایمانی صفات

ان امور کا ذکر قرآن مجید میں جگہ جگہ موجود ہے اور ایک حدیث میں ان کو سمیٹا گیا ہے جس کو حدیث جبریل کہتے ہیں:

''حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک شخص آن پہنچا جس کے کپڑے نہایت سفید تھے اور بال نہایت کالے تھے۔ یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سفر سے آیا ہے اور کوئی ہم میں سے اس کو پہچانتا نہ تھا۔ وہ بیٹھ گیا نبی ﷺ کے پاس آ کر اور اپنے گھٹنے نبی ﷺ کے گھٹنوں سے ملا دیئے اور دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھے (جیسے شاگرد استاد کے سامنے بیٹھتا ہے) پھر بولا: اے محمد ﷺ! بتایئے مجھ کو اسلام کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اسلام یہ ہے کہ تو گواہی دے (یعنی زبان سے کہے اور دل سے یقین کرے) اس بات کی کہ کوئی معبود سچا نہیں سوا اللہ کے، اور محمد (ﷺ) اس

کے بھیجے ہوئے ہیں اور قائم کرے نماز کو اور ادا کرے زکوٰۃ کو اور روزے رکھے رمضان کے اور حج کرے خانہ کعبہ کا اگر تجھ سے ہو سکے۔" (یعنی راہ خرچ ہو اور راستے میں خوف نہ ہو) وہ بولا: سچ کہا آپ نے۔ہم کو تعجب ہوا کہ آپ ہی پوچھتا ہے پھر آپ ہی کہتا ہے کہ سچ کہا (حالانکہ پوچھنے والا لاعلم ہے اور سچ کہنے والا وہ ہوتا ہے جس کو علم ہو تو یہ دونوں کام ایک شخص کیوں کرے گا)۔ پھر وہ شخص بولا: مجھ کو بتائیے ایمان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "ایمان یہ ہے کہ تو یقین کرے (دل سے) اللہ پر، فرشتوں پر (کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پاک بندے ہیں اور اس کا حکم بجالاتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی طاقت دی ہے) اور اس کے پیغمبروں پر (جن کو اس نے بھیجا خلق کو راہ بتلانے کے لئے) اور پچھلے دن پر (یعنی قیامت کے دن پر جس روز حساب کتاب ہوگا اور اچھے اور برے اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی) اور یقین کرے تو تقدیر پر کہ برا اور اچھا سب اللہ پاک کی طرف سے ہے۔" (یعنی سب کا خالق وہی ہے) وہ شخص بولا: سچ کہا آپ نے۔ پھر اس شخص نے پوچھا: مجھ کو بتائیے احسان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے اس طرح دل لگا کر جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے۔" اگر اتنا نہ ہو تو یہی سہی کہ وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ شخص بولا: بتائیے مجھ کو قیامت کب ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "اس کو جس سے پوچھتے ہو وہ خود پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔" وہ شخص بولا تو مجھے اس کی نشانیاں بتلائیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "ایک نشانی یہ ہے کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی۔ دوسری نشانی یہ ہے کہ تو دیکھے گا ننگوں کو جن کے پاؤں میں جوتا نہ تھا، تن پہ کپڑا نہ تھا، کنگال بڑی بڑی عمارتیں ٹھونک رہے ہیں۔" راوی نے کہا: پھر وہ شخص چلا گیا۔ میں بڑی دیر تک ٹھہرا رہا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: "اے عمر! تو جانتا ہے یہ پوچھنے والا کون تھا؟"

دین کے احیاء وبقاء اور اس کی حفاظت کے لیے چار کام

۱۔ مدارس وجامعات میں علمی مجالس کا انعقاد

۲۔ علم پر عمل کے لیے مجاہدہ، کثرتِ ذکر اور صحبتِ صالح۔

۳۔ دین اسلام کی طرف لوگوں کو بلانا اور ان کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانا، جس کو دعوت وتبلیغ کہتے ہیں۔

۴۔ جہاد وقتال

ان چار شعبوں کے اندر دین کے بہت سے کام شامل ہیں مثلاً حصولِ علم کے بھی بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں، اصلاح وتربیت کے بھی، دعوت وتبلیغ کے بھی اور غلبہ دین کے لیے بھاگ دوڑ کے بھی۔ یہ تمام طریقے اگر اصولوں کے مطابق ہوں تو دینِ حق کی خدمت ہے۔

امت میں اتفاق واتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرنا

پہلی آسمانی کتابوں والے اس لیے دین کی صحیح خدمت نہ کر سکے کہ ان کے مابین اختلافات اور داخلی انتشار تھا، اس لیے ان کی ہوا اکھڑ گئی تھی اور وہ دوسری قوموں کے لیے تر نوالہ بن گئے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ ﴾ [الانفال۸: ۴۶]

''اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں نہ جھگڑو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔''

نیز مسلمانوں کو پچھلی امتوں کا حال بیان کر کے تنبیہ کی ہے:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ [آل عمران ۳: ۱۰۵]

''اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جو متفرق ہو گئے اور اختلاف کیا بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح (اصولی) احکام آئے اور ان کے لیے عظیم عذاب ہے۔''

آج کل مسلمانوں کا حال دیکھیے! ہر طرف ان کی پٹائی ہو رہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان امور میں غفلت برتی گئی ہے۔

اتفاق واتحاد کے حوالے سے بھی مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ایک تو جاہل طبقہ ہے جو مسلمانوں کو قومیت، لسانیت وغیرہ کی بنیادوں پر ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہے، دوسری طرف دینداروں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک طرف اجتہادی مسائل کی بنیاد پر مسلمانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں،

دوسری طرف تنظیموں، تحریکوں اور دین کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والے ایک دوسرے کو گرانے اور کمتر دکھانے کی کوشش کررہے ہیں جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ اتفاق کا نعرہ اور اصلاح وتربیت وغیرہ کے نعرے تو سب لگاتے ہیں، لیکن ان کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہوتی ہے ان سے غفلت برتی جاتی ہے۔

اس لیے تحریک ایمان وتقویٰ نے ایک ایسا نظام بنایا ہے اور کچھ ایسے اصول مسلمانوں کے سامنے رکھے ہیں جن کی وجہ سے الحمدللہ ان مقاصد کے حصول میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے کامیابی ہورہی ہے اور مسلمان ایک دوسرے سے قریب ہورہے ہیں۔

اتفاق واتحاد کے زریں اصول

اتحاد کے لیے چند اصول کی پاسداری ضروری ہے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ دین کے اصول جن کے بغیر آدمی مسلمان نہیں رہتا ان پر خوب جم کر چلنا اور فروعی مسائل میں اختلافات کو اپنے درجہ سے نہ بڑھانا۔ اور یہ بات قرآنی اصول سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمۡ﴾ یعنی اہل کتاب سے کہو کہ ہمارے ساتھ ان اصول میں متحد ہو جاؤ جو تمام ادیان میں مساوی ہیں۔"

تو یہ بات اس آیت سے ثابت ہوئی کہ اصول دین میں جب اتحاد ہو جاتا ہے اور ان میں افراط وتفریط ختم ہو جاتی ہے تو فروعات میں اتحاد کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک دوسرے کی رائے کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے اور اپنی رائے کو قرآن وحدیث کا درجہ نہ دیا جائے۔ پس اگر اس بات کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی رائے پر شدت اختیار نہ کی جائے اور جس طرح اکابر باوجود فروعات میں اختلاف کے ایک دوسرے کا حد درجہ احترام کرتے تھے اسی طرح ہم بھی کریں تو اختلاف ختم ہوکر خود بخود اتفاق کی فضا پیدا ہو جائے گی۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ توحید کی آڑ میں توہین سے اور محبت کی آڑ میں شرک سے بچنا۔ بعض لوگ جو توحید کے نام پر کسی محترم کے احترام کو بھی شرک کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں، کیونکہ

ایک ہے عبادت اور ایک ہے اطاعت۔ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوگی۔ اس میں کسی دوسرے کی شمولیت بلاشبہ شرک ہے۔ لیکن کسی قابل احترام ہستی کا اپنے رتبے کے مطابق احترام کرنا شرک نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں: ﴿اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ اس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ اور اولوالامر کی اطاعت بھی مذکور ہے۔

اس کے بالمقابل بعض لوگ اپنے بڑوں کے احترام میں اتنا غلو کر لیتے ہیں کہ ان کی بات کو خدا اور رسول ﷺ کی بات کا درجہ دے دیتے ہیں جو یقیناً غلط ہے۔ اب اگر فریق اول توحید کا نعرہ لگاتے ہوئے انبیائے کرام علیہم السلام واولیائے عظام کی محبت کو شرک قرار دینے سے باز آئے، اور فریق ثانی انبیاء واولیاء کی تعظیم کو اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے مساوی قرار نہ دے، بلکہ صرف جائز امور میں (جو شریعت سے متصادم نہ ہوں) ان کی اطاعت کریں تو نتیجتاً یہ دونوں گروہ گھل مل جائیں گے۔

۴۔ اور چوتھی بات یہ ہے کہ دین کے شعبوں کو تقابلی انداز میں بیان نہ کرنا۔ یعنی جس شعبے سے ہمارا تعلق ہے اس شعبے کی فضلیت میں اتنا غلو نہیں کرنا چاہیے جس سے دوسرے شعبے کی اہمیت کم ہوجائے۔ دین کے ہر شعبے کی اپنی جگہ ایک اہمیت ہوتی ہے جس کو دوسرا شعبہ کما حقہ پورا نہیں کرسکتا۔ لہٰذا اگر ہر شعبہ کے افراد دوسرے شعبوں کو دین کی ضرورت سمجھیں اور ان کے افراد کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں تو سارے دین دار آپس میں ان شاء اللہ تعالیٰ متحد ہوجائیں گے۔ اور امت مسلمہ کی صحیح رہنمائی اور خدمت کرسکیں گے۔

البرہان

ہمیں 'تحریک ایمان وتقویٰ' سے اتفاق ہے اور ہم اس کی حمایت کرتے ہیں۔ تعلیم وتزکیہ پر اصرار، پورے دین پر عمل اور اتحاد امت؛ ہم بھی انہی کاموں کے لیے کوشاں ہیں۔ 'البرہان' انہی مقاصد کے لیے کام کر رہا ہے اور ہماری مجوزہ 'اصلاحی تحریک' انہی اہداف کے لیے کام کرنا چاہتی ہے۔ مزید غور وفکر کے لیے، ہم چند نکات کی نشان دہی کرتے ہیں:

۱۔ مولانا مختار الدین شاہ صاحب نے تزکیۂ نفس کا مقصد اکتسابِ فضائل اور ترکِ رذائل تحریر کیا ہے جو غلط نہیں۔ تاہم اگر جامعیت سے اس کا ذکر کرنا ہو تو ہم یوں کہیں گے کہ تزکیۂ نفس کا

مطلب ہے نفس کی ایسی تربیت، ایسا تزکیہ کہ آدمی پورے دین پر عمل کے قابل ہو جائے جس کو محقق صوفیاء نے یوں کہا ہے کہ 'شریعت طبیعت بن جائے' اور شاہ صاحب اس کے قائل ہیں جیسا کہ ان کے پروگرام کے دوسرے نکتہ سے ظاہر ہے۔

۲۔ ہماری رائے میں تصوف کا ادارہ کافی حد تک بگڑ چکا اور بدنام ہو چکا اور اس میں بہت سے غیر اسلامی افکار اور رسوم ورواج جگہ پا چکے۔ اس لیے ہم تصوف، کی بجائے 'تزکیۂ نفس' کی قرآنی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ نئی بنیادوں پر تزکیہ و تربیت کے ادارے (تربیت گاہیں) وجود میں آنے چاہئیں۔ ہم ایک ماڈل تربیت گاہ (جسے پہلے 'خانقاہ' کہا جاتا تھا) کے بارے میں کافی لکھ چکے ہیں اور ایسی تربیت گاہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ابھی تک قائم نہیں کر سکے تو اس کی وجہ افرادی اور مادی وسائل کی کمی ہے۔ جب تک ہماری مجوزہ نئی تربیت گاہ وجود میں نہیں آتی، موجودہ افراد اور ادارے، جو بڑی حد تک تصوف کی خرابیوں اور مسلک پرستی سے پاک ہوں، ان کا وجود غنیمت ہے، ان کی حمایت کرنی چاہیے اور ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔

۳۔ ہم نے تحریک کے ایک ماہانہ پروگرام 'شبِ تزکیہ' میں شرکت کی۔ اس میں تلاوت قرآن، ذکر جہری وخفی، حمد و نعت (گا کر)، بیان، رات کا کھانا، کارگزاری، کام کی پلاننگ شامل تھے۔ جن چیزوں سے ہمیں عدم موانست محسوس ہوئی وہ یہ ہیں: ختم خواجگان، قرآن کی تلاوت اور حفظ کے فضائل لیکن اس کے ترجمے، تفہیم اور عمل پر عدم تزکیہ۔ مساجد و مدارس کی اصلاح پر عدم توجہ اور روایتی مساجد و مدارس کا قیام۔ قرآن حکیم کی تعلیم پر فوکس کرنے کی بجائے مولانا ذکریاؒ کی کتاب فضائل کا سبقاً مطالعہ (جب کہ علماء کو ان کی ضعیف احادیث اور قصص پر اعتراض ہے)۔ تحریک کے بانی کی روایتی مدح (اکثر لوگ انہیں 'مختار الامۃ' کہتے ہیں)۔ دیوبندی مسلک سے تمسک (دوسرے مسالک برائے نام)۔

فہم دین

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

دینی دعوت میں عوام سے رابطے کی اہمیت

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اس وقت لا دینی تحریکوں کی سب سے بڑی قوت یہ ہے کہ وہ عوام سے براہِ راست ربط پیدا کرتی ہیں اور عوام کی اپنے اصول پر تربیت کرتی ہیں۔ ان کے داعی عملی لوگ ہیں، سرگرم و متحرک ہیں، ایثار وقربانی کی روح رکھتے ہیں، اپنے مقاصد کی خاطر ہر قسم کی مشقتیں برداشت کرتے ہیں اور ان کے پاس عوام کو مشغول رکھنے کے لیے کام ہے۔ یہ تمام پہلو اس وقت کی مضطرب و بے چین طبیعتوں کے لیے مقناطیس کی سی کشش رکھتے ہیں۔

ان لا دینی تحریکوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نہ محض نظری فلسفے موزوں ہیں، نہ کاغذی خاکے، نہ محض دلائل و براہین اور نہ محض دعوتیں، جو خواص کے دائرہ میں محدود ہیں اور عوام کو خطاب کر کے اور ان کو کام پر لگانے کے لیے ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ لا دینی (یا کم سے کم مادی) تحریکیں تمام دنیا میں آگ کی طرح پھیل رہی ہیں اور ان کی سرنگیں تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان تحریکات کا مقابلہ صرف وہ دینی تحریک کر سکتی ہے جو عوام سے ربط و تعلق پیدا کرنا ضروری سمجھتی ہو۔ اس کے کارکن کسی طبقہ کو نظر انداز نہ کریں، وہ غریب کا کوئی جھونپڑا، کسان کا کوئی کھلیان نہ چھوڑیں، کارگاہوں میں جائیں، بیٹھکوں اور چوپایوں میں بھی خطاب کریں۔ ان میں سرگرمی، جفاکشی، سخت جانی اور محنت کشی لا دینی دعوت و تحریک کے پُر جوش کارکنوں سے کم نہ ہو اور خیر خواہی و دل جوئی اور دل سوزی و دردمندی ان میں ان سے کہیں زائد ہو؛ اس لیے کہ اوّل الذکر صرف ان کی معاشی حالت بلند کرنا چاہتے ہیں اور ان کو صرف ان کی ظاہری پست حالی کا درد ہے؛ لیکن دینی دعوت کے کارکنوں کا کام اس سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ انہیں ان کی خدا فراموشی اور بہیمانہ زندگی کا درد ہے جس میں اللہ کی یہ مخلوق پڑی ہوئی ہے اور یہ ان کی دینی، اخلاقی، روحانی اور ذہنی سطح بلند کرنا چاہتے ہیں۔ مقاصد کے اسی فرق و تفاوت کے ساتھ جد و جہد، دل سوزی اور سرگرمی میں بھی کثرت درکار ہے۔ (دینی دعوت، ص: 325-326)

فہم دین

مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ[1]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائضِ منصبی

قرآن حکیم نے چار مقامات پر حضرت خاتم الانبیاء جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چار منصب بیان فرمائے ہیں:

۱۔ آیات پڑھ کر سنانا

۲۔تزکیہ کرنا یعنی کفر وشرک، بدعملی و بداخلاقی اور امور جاہلیت سے ان کو پاک وصاف کرنا

۳۔ کتاب اللہ کے احکام کی تعلیم دینا اور اس کے مضامین کی تشریح کرنا

۴۔ حکمت و دانائی، احکام کے علل و غایات اور شریعت کے اصول و مقاصد کی تعلیم دینا۔

تزکیہ سے مراد عقائد و نظریات اور اعمال و اخلاق کی پاکیزگی ہے۔ قرآن کریم نے تین مقامات پر تزکیہ کو تعلیم سے مقدم ذکر فرمایا، جس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ بقدر ضرورت تزکیہ تعلیم سے پہلے ہونا چاہیے۔ تعلیم اسی وقت مفید اور بارآور ہوسکتی ہے جب قلوب میں اس کے قبول کرنے کی اہلیت اور جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہو، زمین کو پہلے کاشت کے قابل بنایا جائے پھر تخم ریزی کی جائے۔

یہ تزکیہ حضرت خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیضانِ صحبت اور مکارمِ اخلاق سے حاصل ہوتا تھا اور اب بھی بقدر استعداد اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں سے ربط و تعلق اور ان کی صحبت اور مجالست سے حاصل ہوسکتا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ علم کتاب و حکمت سے بھی اصل مقصود تزکیہ ہے، یہ نہ ہو تو ساری تعلیم بے کار ہے۔ اعمال و اخلاق کے بغیر نرے علوم و معارف کی حق تعالیٰ کے یہاں کوئی قدر نہیں۔ آدمی ساری دنیا کی کتابیں چاٹ لے لیکن اگر انسانی اخلاق اور ایمانی اعمال نہیں، تو پڑھا لکھا جانور تو ہوسکتا ہے مگر انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔

تزکیہ کے بغیر نہ ایمان میں رسوخ کی کیفیت اور یقین و اطمینان کی قوت پیدا ہوگی، نہ اخلاق درست ہوسکیں گے، نہ اخلاص کی دولت ملے گی، نہ اعمال پر مداومت نصیب ہوگی، نہ اندر کا فرعون

[1] بانی جامعہ بنوریہ الاسلامیہ، کراچی

(مکار نفس) ہلاک ہوگا، نہ مخلوق سے لڑائی بند ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے پہلے ایمان سیکھا، پھر قرآن سیکھا۔ یہ ایمان کا سیکھنا ہی تزکیہ کہلاتا ہے کہ قلب غیر اللہ کے بتوں سے پاک ہو، اعمال ریا سے پاک ہوں اور نفس کمینے اخلاق سے پاک ہو، معاشرہ امور جاہلیت سے پاک ہو، کمائی حرام اور مکروہ ذرائع سے پاک ہو، وغیر ذلک۔

یہی تزکیہ تھا جس کی وجہ سے حضرت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی بشارتوں سے نوازا اور انہیں آسمانی وحی کی شہادت اور سند ملی۔ سورۃ الفتح میں ان کے امتیازی اوصاف ذکر کرتے ہوئے ایک وصف باہمی رحمت وشفقت ذکر کیا گیا ہے: رحماء بینھم، یہ وصف کامل تزکیہ کے بعد ہی حاصل ہوسکتا ہے اور اسی کو نہ سمجھنے کی خرابی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرامؓ کا پہلا وصف یہی بیان فرمایا کہ ان کے دل بہت پاک صاف تھے۔ دوسرا وصف یہ بیان فرمایا کہ ان کی زندگی تکلفات اور تصنع سے پاک تھی۔

حضرات صوفیا اور اشاعتِ دین

حضرات صوفیائے کرام جن کے ذریعہ دین کی تبلیغ واشاعت، سلاطین کی تلوار اور علماء کے قلم سے بھی زیادہ ہوئی ہے، ان کا خاص موضوع یہی ہے کہ نفوس کی تربیت اور اخلاق کا تزکیہ کیا جائے۔ ان کے یہاں بھی تربیت کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پہلے جذب ہو، پھر سلوک، اسی کا نام مجذوب سالک رکھتے ہیں۔ بظاہر یہ طریقہ اقرب الی القرآن ہوگا۔

البتہ قرآن کریم میں صرف ایک جگہ جہاں آنحضرت ﷺ کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا نقل فرمائی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے ان چار مناصب میں سے تزکیہ کو کتاب وحکمت کی تعلیم کے بعد سب سے آخر میں رکھا ہے۔ اس سے ایک تو اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کا اول وآخر مقصد تزکیہ ہے۔ دوسرے اس طرف اشارہ ہے کہ تزکیہ بقدر ضرورت تو تعلیم سے پہلے ہونا چاہیے مگر کامل تزکیہ کی نوبت علم کے بعد ہی آسکتی ہے۔ یعنی علم کے بعد عمل ہوگا اور علم ہی ذریعہ بنے گا عمل کا۔ گویا اس آیت میں تربیت کا دوسرا طریقہ بیان فرمایا ہے، جو حضرات صوفیہ کے یہاں سالک مجذوب کہلاتا ہے۔ لوگوں کی استعدادیں مختلف ہوتی ہیں' کسی کو تعلیم کے

بعد بھی تزکیہ کی ضرورت رہتی ہے اور کسی کو تزکیہ کے بعد تعلیم کی حاجت ہوتی ہے۔ نہ تزکیہ کے مراتب ختم ہوتے ہیں اور نہ تعلیم کی انتہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منصب صرف تعلیم اور سمجھانا ہی نہیں تھا بلکہ اس کی تعمیل کرانا اور قوم کو ایک باعمل امت بنانا بھی تھا۔ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیے ہوئے نقشہ کے مطابق تعلیم وتربیت پر محنت ہوتی اور افرادی اصلاح کے ذریعہ ایک پاکیزہ اور صالح معاشرہ وجود میں نہیں آتا، سیاسی محنت صحیح طریق پر بارآور نہیں ہوگی اور تمام قوتیں شر وفساد کی نذر ہو جائیں گی۔

اسلامی ریاست اور موجودہ سیاست

دینی تربیت کے فقدان ہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے باوجود کہ تمام زعماء اور سیاسی لیڈر اسلامی خدمت کا اعلان فرمارہے ہیں اور ملک وملت کی صحیح نمائندگی کا دم بھرتے ہیں، یقیناً ان میں سے بعض حضرات مخلص بھی ہوں گے اور وہ اسلام کے نام کو محض اقتدار طلبی کے لیے استعمال نہیں کرتے ہوں گے، لیکن ان اسلامی نمائندوں کی اکثریت اس بات سے بھی واقف نہیں کہ جس اسلام کا ہم نام لیتے ہیں، اسی اسلام نے سیاست کے بھی کچھ آداب تجویز کئے ہیں اور بے ہنگم سیاست بازی پر کچھ پابندیاں کی ہیں مثلاً موجودہ سیاست کی بنیاد ہی اس بات پر قائم ہے کہ ایک شخص اقتدار طلبی کے لیے کھڑا ہو، اپنی پارٹی بنائے، اپنا پروگرام قوم کے سامنے رکھے اور قوم سے اپیل کرے کہ اس کو ووٹ دے کر کرسی اقتدار پر فائز کیا جائے اس کے بعد وہ جانے اور قوم کے مسائل۔

اب دیکھئے کہ اسلام اقتدار طلبی کے مزاج ہی کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اسلام اقتدار کی خواہش کو پسند نہیں کرتا بلکہ وہ یہ ذمہ داری معاشرہ پر ڈالتا ہے کہ وہ ایسے افراد کو آگے لائے جو 'لَا یُرِیۡدُوۡنَ عُلُوًّا فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فَسَادًا' ''جو نہیں چاہتے زمین میں اونچا ہونا اور نہ فساد'' کے معیار پر پورے اُتریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی ایسے شخص کو جو عہدہ کی درخواست لے کر آئے عہدہ نہیں دیتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر اور منتیں کر کر کے حضرات صحابہ کرامؓ کو عہدے دیئے تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو عہدۂ قضاء کی پیش کش کی، انہوں نے انکار کیا۔ امیر المؤمنینؓ نے فرمایا: تمہارے باپ نے بھی تو قبول کیا تھا؟ عرض کیا: ان میں ہمت ہوگی، مجھ میں نہیں۔ امیر المؤمنینؓ نے منت وسماجت کی، مگر ان کی معذرت غالب آ گئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بہت اچھا مگر کسی اور کو نہ بتانا، ورنہ کوئی بھی اس کے لیے آمادہ نہ ہوگا۔

فہم دین/مکالمہ مدیر

جاوید غامدی صاحب کے بارے میں
البرہان کا سخت مؤقف کیوں؟
غامدی صاحب کے ایک مدّاح کے خط کے جواب میں چند گزارشات

توہین رسالت اور سانحۂ سیالکوٹ کے بارے میں جاوید احمد غامدی صاحب نے جو لکھا اور کہا، اس کے جواب میں البرہان کے جنوری ۲۰۲۲ء کے شمارے میں کچھ مضامین چھپے۔ ان کے ردّعمل کے طور پر ہمیں ان کے ایک مداح کا خط موصول ہوا ہے۔ پہلے آپ یہ خط پڑھیے اور پھر اس پر ہمارا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے۔ وہ لکھتے ہیں:

''البرہان کے جنوری کے شمارے سے استفادہ کیا۔ بہت چشم کشا اور فکر انگیز موضوعات پر کلام کیا گیا ہے۔ خاص طور پر حافظ ابرار حسین صاحب کے دونوں مضامین بعنوان 'دینی مدارس اور جدید علوم' اور 'اسلامی افغانستان: زوال پذیر مغربی تہذیب کا مدفن' بہت عمدہ تھے۔ مغربی تہذیب کی ہلاکت خیزیوں ، سرمایہ دارانہ نظام کی چیرہ دستیوں، سائنس وٹیکنالوجی کی تباہ کاریوں، استشراق کی ریشہ دوانیوں، استعمار اور جدیدیت وتجدد کے موضوعات پر آپ کے مقالات کے علاوہ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب، سید خالد جامعی صاحب اور دیگر اہل علم کے مضامین بھی، ہمعصر دنیا اور اس کے رجحانات کو سمجھنے کے لیے، لائق مطالعہ اور غور وفکر کے متقاضی ہیں۔ تزکیۂ نفس، اصلاح باطن اور تربیت کے حوالے سے جناب احمد جاوید صاحب کے افادات بہت خاصے کی چیز ہیں۔

کچھ عرصے سے محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کے مؤقر جریدے میں جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار کو بہت زیادہ موضوع بحث بنایا جا رہا ہے اور اندازِ نگارش میں بھی بہت زیادہ شدت اور تلخی آ گئی ہے۔ یقیناً یہ شدت تاثر اور سخت لب ولہجہ آپ کی دینی غیرت وحمیت پر دلالت کرتا ہے اور تنقید کا یہ ناخوشگوار فریضہ حمایت حق کے جذبے سے کیا جا رہا ہے۔ اگر میری باتوں کو دریدہ دہنی پر محمول نہ کیا جائے تو کچھ معروضات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

غامدی صاحب کی ذات کی بجائے ان کے افکار وخیالات کو زیر بحث لایا جائے۔ یہ بات میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ غامدی صاحب پر جب محترم نادر عقیل انصاری صاحب کی

تنقیدات سامنے آئیں تو جناب احمد جاوید صاحب (جو خود بھی غامدی صاحب کی فکر کے ناقدین میں سے ہیں) نے انصاری صاحب کے اسلوب نگارش کو اچھا نہیں سمجھا تھا اور کہا تھا کہ نادر صاحب غامدی صاحب پر تنقید کی پوری اہلیت رکھتے ہیں لیکن ان کی زبان و بیان سے یہ تاثر ملتا ہے گویا وہ ان سے ذاتی لڑائی لڑ رہے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ توہین رسالت کی سزا کے حوالے سے آپ نے ،مولانا رفیق صاحب اور سید خالد جامعی صاحب نے غامدی صاحب پر جو محاکمہ کیا ہے لگتا یوں ہے جیسے ان کی گفتگو بعنوان 'سانحۂ سیالکوٹ کے اصل ذمہ داران کون؟' کو مدار بنا کر کیا گیا ہے حالانکہ اس گفتگو کا ایک خاص سیاق تھا اور جب غامدی صاحب توہین رسالت کے قانون پر بات کرتے ہیں تو اصل میں اس کی مروجہ صورت اور اس قانون کے نفاذ کے طریقہ کار پر نقد کرتے ہیں جس میں ان کے خیال میں سقم پائے جاتے ہیں۔ بہتر یہ تھا کہ اس حساس فقہی اور قانونی مسئلے پر کلام کرتے ہوئے ان کی ۲۰۱۱ء کی تحریر 'توہین رسالت کی سزا' (جو ان کی کتاب 'مقامات' میں شامل ہے) کے مندرجات کو سامنے رکھ کر تجزیہ و تنقید کی جاتی اور غلطی واضح کی جاتی۔ اسی محولہ بالا مضمون میں غامدی صاحب نے یہ بات بھی نہایت صراحت سے لکھی ہے کہ ان کے اختلاف کے باوجود توہین رسالت کی سزا کے حوالے سے فقہ حنفی کا قانون بہت معقول ہے کیونکہ اس میں مجرم (اگر وہ ملزم نہیں بلکہ ثابت شدہ مجرم ہو) کو توبہ اور اصلاح احوال کا موقع دیا جاتا ہے لیکن اگر وہ اصرار کرتا ہے تو بلاشبہ وہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گستاخی جیسے شنیع جرم کا مرتکب ہے اور فساد فی الارض کر رہا ہے اس لیے وہ سنگین سزا کا مستوجب ہے۔ باقی یہ بات درست ہے کہ غامدی صاحب کی فکر میں جدیدیت زدگی اور مغرب گزیدگی کے اثرات پائے جاتے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ مسئلہ تنہا غامدی صاحب یا ان کے حلقہ فکر کا نہیں ہے۔ مغربی تہذیب (جسے بجا طور پر بے خدا تہذیب کہا جاتا ہے) کا فکری و عملی استیلاء روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس کی اقدار، اس کے اوضاع، اس کے علوم وفنون، اس کے طرز تعمیر، طرز زندگی کا trickle down effect پوری دنیا بالخصوص مسلم سماج اور ریاستوں پر ہے۔ ہمارے استاد کہا کرتے ہیں کہ مغربیت اور جدیدیت سے کوئی بھی بچا ہوا نہیں، شیعہ ہوں یا سنی ، دیوبندی ہوں یا بریلوی، تبلیغی ہوں یا انقلابی ،صوفی ہوں یا سلفی سب Westoxified ہیں، بس نوعیت کا فرق ہے۔ کوئی کم کوئی زیادہ متاثر ہے۔ کوئی مرعوب ہے،

کوئی مسحور ہے اور کوئی مغلوب ہے۔

مَیں غامدی صاحب کو دین کے خدام میں سے سمجھتا ہوں۔ میری ناقص سمجھ میں وہ قابل استفادہ ہیں کیونکہ اخلاص، علم اور سیرت و کردار کے لحاظ سے مطلوبہ معیار پر پورا اترتے ہیں۔ ان کے بڑا آدمی ہونے میں کوئی شک نہیں اور ویسے بھی ہر قد آور شخصیت کے ساتھ یہ سانحہ ہوتا رہا ہے کہ اس کے غالی معتقدین کے پہلو بہ پہلو غالی ناقدین بھی ہوتے ہیں۔ مَیں غامدی صاحب کی فکر پر ہونے والی تقریباً ہر تحریر انہماک اور دلچسپی سے پڑھتا ہوں تاکہ تصویر کا دوسرا رخ سامنے رہے اور ان کی فکر کے کمزور پہلو بھی پیش نظر رہیں۔ ڈاکٹر زبیر صاحب، ڈاکٹر محمد مشتاق احمد صاحب، محمد دین جوہر صاحب، ڈاکٹر زاہد صدیق مغل صاحب، حامد کمال الدین صاحب اور جناب وقار اکبر چیمہ صاحب میرے پسندیدہ فیس بک لکھاری ہیں اور یہ بات بھی مَیں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ سب اہلِ علم غامدی صاحب کے نظامِ فکر کے ناقد ہیں۔ ہم نے اپنے بزرگوں اور اساتذہ سے ایک بات یہ بھی سیکھی ہے کہ علمی استفادہ سب سے کریں اور تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن کے لیے کسی ایک ہی مربی سے تعلق رکھیں (بیعت ہونا ضروری نہیں اصل چیز اصلاح ہے)۔

یہ کچھ ٹوٹے پھوٹے بے ربط تاثرات تھے جو سوچا آپ سے شیئر کروں۔ امید ہے آپ ناراض نہیں ہوں گے اور اگر کوئی بات ناگوار لگے تو اس کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔ آپ ہمارے محسن بزرگ ہیں۔ اللہ پاک آپ کو اور آپ کے اہل وعیال کو ایمان، صحت اور عافیت سے نوازے، آمین۔ اللّٰھم ارنا الحق حقًا و ارزقنا اتباعه، وارنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابه. (آمین)''

البرہان

اس خط کے جواب میں علمی وفکری پہلو سے گفتگو سے قبل ایک دو ہلکی پھلکی باتیں:

بڑا آدمی کون ہوتا ہے؟

۱۔ ہمارے بھائی فرماتے ہیں کہ غامدی صاحب بڑے آدمی ہیں اور ہر بڑے آدمی کی طرح ان کے غالی معتقدین بھی ہیں اور غالی نقاد بھی۔ اگر وہ ہمارے علم میں اضافہ کرنا چاہیں تو ہمیں بتائیں کہ بڑا آدمی کون ہوتا ہے؟ وہ جو اچھا ادیب ہو، اچھا مقرر ہو، بہت امیر ہو، بہت مشہور ہو، بہت طاقتور ہو، منفرد خیالات رکھتا ہو، اپنی قوم اور اپنے لوگوں کے لیے اس نے محنت کی ہو، ایثار

کیا ہو؟ پاکستانی عموماً قائداعظم اور علامہ اقبال کو بڑا آدمی سمجھتے ہیں۔ بھارتی گاندھی کو، برطانوی چرچل کو، امریکی جارج واشنگٹن کو، روسی سٹالن کو اور چینی ماؤزے تنگ کو بڑا آدمی سمجھتے ہیں۔

اس میں کچھ ہم مسلمانوں کی تہذیبی روایات بھی ہیں۔قرآن ان کو بہترین قرار دیتا ہے جو تقویٰ میں دوسروں سے بڑھ کر ہوں۔حضرت عمرؓ حضرت بلالؓ کو 'سیدنا بلال' کہا کرتے تھے؟ ہارون رشید حج پر آیا، طواف کر رہا تھا' اس نے دیکھا لوگ اس کی طرف ملتفت نہیں۔ایک آدمی سادہ سا، معمولی کپڑے پہنے، ہاتھ میں جوتا پکڑے طواف کر رہا ہے۔لوگ اس کے آگے بچھے جاتے ہیں، مودب ہیں۔ پوچھا یہ کون ہے؟ بتایا گیا سالم بن عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔اس نے کہا: اصل بادشاہ تو یہ ہیں جو لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔تو سوال یہ ہے کہ بڑا آدمی کون ہوتا ہے؟ اور کیا ہر بڑا آدمی معیارِ حق و باطل ہوتا ہے؟ اور کیا ہر بڑا آدمی قابلِ اتباع ہوتا ہے؟

علم سب سے حاصل کرو

۲۔ وہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے اصول بنا رکھا ہے کہ تربیت ایک شخص سے حاصل کرو لیکن علم سب سے حاصل کرو، سب کو پڑھو۔سوال یہ ہے کہ سب کو پڑھ کر کوئی رائے بھی قائم کرنی ہے کہ نہیں؟ کون صحیح کہہ رہا ہے اور کون غلط کہہ رہا ہے؟ یہ بھی فیصلہ کرنا ہے کہ نہیں؟ ظاہر ہے اگر دو عالم یا مفکر ایک دوسرے سے مختلف و متضاد رائے رکھتے ہوں تو آپ بیک وقت دونوں کو صحیح قرار نہیں دے سکتے۔آپ کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ کس کی رائے صحیح ہے؟ آپ کو Gray ایریا اور ریڈ لائن کا تعین کرنا ہوگا کہ یہ ایریا اجتہادی اور فروعی اختلافات کا ہے لیکن اس سے آگے بڑھ کر دین کے اصول ہیں۔ان میں اختلاف کرنا ریڈ لائن کراس کرنا ہے۔آپ کو طے کرنا ہوگا کہ اجتہادی اختلافات کی حد کہاں ختم ہوتی ہے اور گمراہی کی سرحد کہاں سے شروع ہوتی ہے ورنہ تو آپ مثلاً مولانا قاسم نانوتویؒ اور غلام احمد قادیانی دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیں گے، جو ظاہر ہے صحیح نہیں۔

غامدی صاحب کی فکر کا تجزیہ

۳۔ میں نے جاوید احمد غامدی صاحب کو پڑھا بھی ہے، سنا بھی ہے اور دیکھا بھی ہے اور جہاں تک وہ پہنچ چکے ہیں، اس کے بعد میری یہ سوچی سمجھی رائے ہے، بغیر کسی غصے، نفرت، تعصب اور اشتعال کے، کہ وہ دین میں جائز اختلاف کی سرحد عبور کر چکے ہیں اور گمراہی کے ایریا

میں داخل ہو چکے ہیں۔ان کو گمراہ قرار دینے کے میرے پاس تین دلائل ہیں۔

i۔ ان کا الحادی مغربی تہذیب کی فکری بالادستی کو تسلیم کرنا اور اسلام کی ایسی تشریح کرنا جو مغربی فکر و تہذیب کے مطابق ہو۔ یہ کور ایشو (Core Issue) ہے۔

ii۔ سنت کا انکار و استخفاف جو دین کا بنیادی ماخذ ہے۔ یہ فروعی یا اجتہادی مسئلہ نہیں، اصول میں اختلاف ہے۔

iii۔ امت اور اس کے اہل علم کے چودہ سو سالہ اجتماعی علم و تعامل کو رد کر کے یہ سمجھنا کہ صرف انہوں نے دین کو صحیح سمجھا ہے۔

دوسرا اور تیسرا نکتہ بھی دراصل پہلے نکتے ہی کی پیداوار ہے۔اس لیے ہم نے پہلے نکتے کو کور ایشو کہا ہے۔ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ میں اپنے اس موقف کو ذرا وضاحت سے بیان کروں۔تاہم یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ اختصار بعض اوقات مخل فہم ہوتا ہے اس لیے سنجیدہ قاری کو اس موضوع پر میری کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔[۱]

اصل فکری مسئلہ یہ ہے کہ مسلم امت زوال پذیر کیوں ہوئی اور وہ اس سے کیسے نکلے؟ اور آج مسلم فرد اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کیسے بسر کرے کہ اسے دنیا و آخرت میں فلاح اور کامیابی ملے؟ پھر مغربی فکر و تہذیب کے علمبردار ممالک نے مسلم امت کے زوال پذیر ہونے میں کردار ادا کیا اور وہ اس کے زوال سے نکلنے میں بھی مانع ہے نیز مغربی فکر و تہذیب کفر و الحاد پر مبنی ہے اور اس کے علمبردار ممالک کی اسلام و مسلم دشمنی نمایاں کالشمس ہے اور یہ فکر و تہذیب آج دنیا پر غالب ہے اور مسلم فرد، معاشرے اور ریاست پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے تو مسلم اہل علم و فکر کے سامنے اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ وہ طے کریں کہ مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کے بارے میں ان کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

اس حوالے سے تین مکاتب فکر سامنے آتے ہیں:

---

[۱] اسلام اور مغربی فکر و تہذیب پر میری تین کتابیں مکتبہ البرہان نے طبع کی ہیں ۱۔ اسلام اور ردمغرب ۲۔اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش ۳۔اسلام اور مغرب میں اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ۔ یہ کتابیں اور ان کی Pdf فائلز البرہان سے طلب کی جاسکتی ہیں۔

پہلا رویہ بعض اہل علم کا یہ سامنے آیا کہ وہ مغربی تہذیب کے فکری غلبے کے آگے ڈھے گئے، اس سے مرعوب ہو گئے، انہوں نے اسے حق جانا اور سمجھا اور انہوں نے اسلامی تعلیمات کی ایسی تشریح وتاویل شروع کی جو مغربی فکر وتہذیب کے اصولوں اور تقاضوں کے مطابق ہو اور اس کے علمبردار مغربی ممالک کے مفادات کے مطابق ہو۔ برصغیر میں یہ لَے سرسید احمد خاں سے شروع ہوئی اور امیر علی، غلام احمد قادیانی، احمد الدین امرتسری، غلام احمد پرویز، مولانا وحید الدین خان سے ہوتی ہوئی چلی آ رہی ہے اور آج کل پاکستان میں اس کے علمبردار جناب جاوید احمد غامدی اور ان کے تلامذہ (خصوصاً ڈاکٹر عمار ناصر اور خورشید ندیم) ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی ایسی تشریح وتاویل کرنا کہ وہ مغربی فکر وتہذیب کے مطابق ہو جائیں، اس کے لیے ان حضرات کو جو تجدید کے نام پر تجدد پھیلاتے ہیں، دو ہتھیار استعمال کرنے پڑتے ہیں: ایک سنت رسول ﷺ کی حجیت کا انکار کیونکہ یہ سنت ہے جو قرآنی احکام کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ سنت کی حجیت سے انکار سے ان کے لیے قرآن کی من مانی تفسیر کرنے کا راستہ کھل جاتا ہے۔ ان کی دوسری ضرورت یہ ہوتی ہے کہ وہ پچھلی چودہ سو سالہ مسلم علمی روایت یعنی جمہور علماء و مجتہدین کی آراء اور امت کے تعامل کو رد کریں تاکہ اسلامی تعلیمات کو مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کے مطابق ثابت کرنے کے لیے انہیں نئی آراء قائم کرنے کی مکمل آزادی مل سکے۔

جاوید احمد غامدی صاحب کی ساری فکر کا حاصل یہی ہے کہ مذکورہ بالا دونوں ہتھیاروں کو استعمال کر کے اسلام کو مغربی فکر وتہذیب کے مطابق ثابت کیا جائے اور مغربی فکر وتہذیب کو اسلام کے مطابق قرار دیا جائے تاکہ اس کے نتیجے میں جمہور علماء اور عوام میں مغرب سے وحشت اور اس کی مخالفت ختم ہو جائے اور وہ 'روشن خیالی'، 'خوش حالی' اور 'ترقی' کے لیے مغربی فکر وتہذیب اور اس کے اصول واقدار اور اداروں کو بخوشی اپنانے پر تیار ہو جائیں۔ ہم نے البرہان کے ایک سابقہ شمارے میں غامدی صاحب، مغرب اور اسلام تینوں کے موقف کا ایک جدول میں آمنے سامنے ذکر کر کے یہ واضح کیا تھا کہ کس طرح غامدی صاحب کا موقف اسلام کے روایتی موقف کے مقابلے میں مغربی موقف کے مطابق ہے۔ ہم اس کی تلخیص یہاں عرض کیے دیتے ہیں:

سیاست: مغربی جمہوریت اور نیشن سٹیٹ کی حمایت، اسلامی ریاست کی نفی اور سیکولر سٹیٹ کا اثبات، دینی سیاسی جماعتوں کا رد، ریاست کے ذریعے نفاذ شریعت اور غلبۂ اسلام کی

نفی، اسلام مخالف اور پرومغرب رجحانات رکھنے والے حکام کی حمایت واعانت۔

قانون: اسلامی حدود کی مخالفت، زنا بالرضاء کو ہلکا قرار دے کر اس کی سزا کو کم کرنا۔ عورتوں کو وہ حقوق دلانا جو مغرب کے طے کردہ بنیادی حقوق کے مطابق ہوں۔ قانون توہین رسالت کی مخالفت کرنا، رجم کی سزا کا انکار کرنا، قانون شہادت میں عورت اور مرد کی گواہی برابر قرار دینا وغیرہ۔

معاشرت: برقعہ اور دوپٹے کی کوئی شرعی حیثیت نہیں، مسلم لڑکی غیر مسلم سے نکاح کر سکتی ہے۔ گانے بجانے اور تصویر کی حمایت۔ مخلوط معاشرت اور تعلیم کی حمایت۔

دوسرا نقطۂ نظر ان لوگوں کا ہے جو اسلامی روایت پر قائم رہتے ہوئے اس کی تعلیمات اور مغرب کی الحادی فکر وتہذیب میں توافق اور تلفیق کو ممکن سمجھتے ہیں۔ جیسے علامہ اقبال اور مولانا مودودیؒ اور ہم عصروں میں مولانا تقی عثمانی، پروفیسر خورشید احمد، جناب احمد جاوید اور مولانا زاہد الراشدی وغیرہ۔ یہ لوگ اسلامی جمہوریت، اسلامی بینکنگ اور مغرب کے انسانی حقوق وغیرہ کی اسلام کاری کے قائل ہیں۔ تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو اسلامی تقاضا یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کو رد کر دیا جائے اور فرد، معاشرے اور ریاست کی تشکیل نو کے لیے اسلامی روایت پر اصرار کیا جائے، اور اجتہادی سپرٹ بھی برقرار رکھی جائے۔ ان میں کراچی سے ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری اور ان کے تلامذہ خصوصاً سید خالد جامعی اور لاہور کے علمی حلقوں میں راقم السطور اور حامد کمال الدین صاحب شامل ہیں۔ جمہور علماء بھی اس گروہ میں شامل ہیں اگرچہ وہ پہلے دو نقطہ ہائے نظر کا ردّ دینیاتی مسائل کے تناظر میں کرتے ہیں نہ کہ مغربی فکر وتہذیب کی حمایت کے تناظر میں۔

خلاصہ یہ کہ غامدی صاحب کا اختلاف علماء کے اجتہادی اور فردعی اختلافات کی قبیل کا نہیں ہے کہ اسے قابل قبول اختلاف سمجھا جائے بلکہ یہ تجدد اور گمراہی ہے جو نا قابل قبول ہے اور یہ راقم الحروف کا ذاتی موقف نہیں ہے بلکہ یہ پاکستان کے جمہور علماء کا موقف ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ پاکستان کے مختلف دینی مکاتب فکر کے علماء کرام کی مشترکہ علمی مجلس ''ملی مجلس شرعی'' کے نام سے قائم ہے۔ اس میں غامدی صاحب کے افکار پیش ہوئے۔ بعض لوگوں نے ان کی تکفیر کا مشورہ دیا اور بعض دینی مدارس کے شعبہء افتاء کے فتوے بھی پیش کیے گئے۔ تاہم علماء کی اکثریت نے ان کے افکار کو گمراہی سے تعبیر کیا اور مسلم عوام کو خبردار کیا کہ ان کے غیر اسلامی افکار سے بچیں۔

ذاتی تنقید

آپ کا یہ مطالبہ بھی بجا ہے کہ غامدی صاحب کے افکار پر تنقید کی جائے، ان کی ذات پر نہیں۔تنقید 'ذاتی' تب ہوگی جب میری ان سے کوئی ذاتی رنجش ہو۔ انہوں نے مجھے کوئی نقصان پہنچایا ہو، میں ان سے انتقام لینا چاہوں لیکن مَیں اگر کہوں کہ غلام احمد قادیانی جھوٹا تھا کیونکہ اس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا۔ یا غلام احمد قادیانی گندا آدمی تھا کیونکہ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں گندی زبان اپنی کتابوں میں استعمال کی ہے اور ان باتوں کے ثبوت بھی پیش کروں تو کیا یہ تنقید 'ذاتی' شمار ہوگی؟ میری رائے میں نہیں کیونکہ قادیان نامی قصبے میں رہنے والے غلام احمد سے میری کوئی ذاتی پرخاش نہیں، اس سے میرا کوئی لینا دینا نہیں بلکہ اس کے غلط افکار کی وجہ سے میں اسے غلط آدمی کہہ رہا ہوں۔ لہٰذا میرا اس سے اختلاف ذاتی نہیں علمی اور فکری ہے۔

مَیں نے آج تک جاوید غامدی صاحب کے بارے میں ان کے افکار کو غلط سمجھنے اور کہنے کے باوجود ان کے بارے میں کبھی سخت زبان استعمال نہیں کی تھی کیونکہ ان کی بعض ذاتی خوبیوں کا مَیں خود شاہد اور قائل ہوں لیکن اس دفعہ وہ خود متانت اور صداقت کی حد عبور کر گئے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۹۵ء میں اپنے کتابچے 'حدود وتعزیرات' (ص ۴ مطبوعہ المورد) میں لکھا تھا کہ توہین رسالت کی سزا قتل ہے اور اس کا منبع فساد فی الارض کی بناء پر آیت حرابہ کو قرار دیا تھا۔ اب خود آپ نے ان کی 'مقامات' والی ۲۰۱۱ء کی تحریر کے حوالے سے ان دونوں باتوں کی تصویب کی ہے کہ اس سزا کا حکم فقہ حنفی میں بھی موجود ہے اور قرآن حکیم کی آیت حرابہ میں بھی۔ لیکن آپ ہی نے ''توہینِ رسالت کی سزا'' کے عنوان سے ان کی جو تحریر مجھے ۱۰ دسمبر ۲۰۲۱ء کو واٹس ایپ کی تھی، اس میں وہ کہتے ہیں کہ ''توہینِ رسالت کی سزا قرآن وسنت اور فقہ میں موجود ہی نہیں'' حالانکہ اسی مضمون میں انہوں نے ان تین احادیث کو صحیح اور قابل اعتماد کہا ہے جن کی رو سے جمہور علماء توہینِ رسالت کی سزا قتل قرار دیتے ہیں لیکن غامدی صاحب نے گھما پھرا کر ان کی تاویل کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان احادیث میں آنحضرت ﷺ کے حکم قتل کی وجہ دوسری تھی، توہین نہ تھی۔ انہوں نے دوسری احادیث کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ موجود ہیں لیکن ان کے نزدیک ضعیف ہیں۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ اس باب میں امام ابوحنیفہ کی رائے دوسروں سے اَصْوَب ہے۔ گویا وہ تسلیم کرتے ہیں کہ دوسرے فقہاء نے بھی اس بارے میں آراء دی ہیں۔ خود ان کے شاگرد ڈاکٹر عمار ناصر صاحب

نے فقہاء کی آراء کا تجزیہ کرتے ہوئے پوری کتاب لکھی ہے لیکن غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ سزا فقہ میں موجود ہی نہیں۔ مَیں کہتا ہوں صحابہ کرامؓ اور تابعین سے لے کر پچھلی چودہ صدیوں میں ہر صدی میں بے شمار علماء کرام نے توہین رسالت کی سزا قتل ہونے پر بحث کی ہے اور مسلمانوں نے اور ان کے حکمرانوں نے اس پر عمل کیا ہے۔

اس سب کے باوجود اگر وہ آج کہتے ہیں کہ توہین رسالت کی سزا (قتل) قرآن وسنت اور فقہ میں موجود ہی نہیں تو اسے مَیں جھوٹ نہ کہوں تو کیا کہوں؟ اسے مَیں خلاف دیانت نہ سمجھوں تو کیا سمجھوں؟ آپ ہی بتا دیجیے کہ جھوٹ کس کو کہتے ہیں اور جھوٹا کسے کہتے ہیں؟ بھائی! سیدھی سی بات ہے ان کو کہنا چاہیے تھا کہ جمہور علماء وفقہاء جن آیات واحادیث سے توہین رسالت کی سزا (قتل) مستنبط کرتے ہیں، مجھے ان سے اختلاف ہے۔ اگر وہ یہ کہتے تو میں ان کی رائے کو غلط ضرور کہتا لیکن ان سے جھوٹ کبھی منسوب نہ کرتا۔ لیکن پہلے انہوں نے کہا کہ یہ سزا قرآن میں موجود ہے۔ پھر اسی آیت کی ایسی تاویل کر دی کہ اب یہ اس سے ثابت نہیں ہوتی۔ اس موضوع پر صحیح احادیث کی بھی انہوں نے تاویل کر دی اور فقہاء میں سے اس فقیہ کی رائے کی تصویب کر دی جو انہیں پسند ہے۔ اور اس کے بعد کہہ دیا کہ توہین رسالت کی سزا (قتل ہونے) کا قانون نہ قرآن وسنت میں موجود ہے نہ فقہ میں۔ آپ بتائیے یہ جھوٹ ہے کہ نہیں؟ اور جو جھوٹ بولے اسے جھوٹا کہتے ہیں یا نہیں؟ آپ اگر ذوقاً جھوٹ بولنے والے کو جھوٹا نہیں کہنا چاہتے تو آپ کی مرضی۔ لیکن مَیں اگر جھوٹ بولنے والے کو جھوٹا کہوں تو آپ مجھے غلط کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اور میرے اس اختلاف کو ''ذاتی اختلاف'' کیسے کہہ سکتے ہیں؟ آج کے متجددین نے یہ ذوق لوگوں میں پیدا کر دیا ہے کہ چودہ سو سالہ علمی روایت کوئی چیز نہیں گویا دین آج نازل ہوا ہے کہ وہ اس کا مطلب ہمیں سمجھانے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں ورنہ میں اگر کسی مسلمان سے پوچھوں کہ مُسَیلمہ کون تھا تو شاید وہ مجھے نہ بتا پائے لیکن اگر مَیں پوچھوں کہ 'مُسَیلمہ کذّاب' کون تھا تو مجھے دین کا ہر طالب علم بتائے گا کہ مُسَیلمہ کذّاب کون تھا؟ کیونکہ اس کا جھوٹا اور کذّاب ہونا اس کے نام سے زیادہ معروف ہے۔ O تو مسلمان تو چودہ صدیوں سے جھوٹے کو جھوٹا کہتے آ رہے ہیں اور اس سے نہیں شرماتے تو میں کسی جھوٹے کو جھوٹا کہتے کیوں شرماؤں؟

بھائی! میری ان گزارشات پر بھی غور فرمایئے گا۔

تفہیم دین　　ادریس آزاد[1]

مغربی سائنس۔منزل ہے کہاں تیری؟

بطور انسان یہ ہماری آخری صدی ہے

[ماہرین علوم اسلامیہ سے درخواست ہے کہ وہ اس مضمون پر تبصرہ فرمائیں،اختصار کے ساتھ۔مدیر]

یہ مضمون میں نے آج سے سات سال پہلے لکھا تھا۔تب کوئی بھی یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ انسان کو سؤر کا دل لگائے جانے کی تیاریاں ہورہی ہیں۔آج جب دل لگ گیا ہے تو مجھے اپنا مضمون یاد آیا۔ایک بار پھر پڑھیے۔ہوسکتا ہے میری باقی توقعات اور پیشگوئیوں پر اس مرتبہ آپ کی ذرا ہمدردانہ نظر پڑسکے)

آج سے ایک صدی بعد دنیا میں انسان نہیں ہوں گے۔اگر ہوئے بھی تو بہت کم ہوں گے اور شاید افریقہ کے دور دراز صحراؤں کے کسی اکّا دُکّا گاؤں میں پائے جائیں۔لیکن اس سے پہلے کہ ہم اِس عجیب وغریب دعوے کو سمجھنے کی کوشش کریں ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ جان لیں کہ ''ٹرانس ہیومن اِزم'' ہے کیا؟

لیکن ٹرانس ہیومن اِزم سے بھی پہلے ہمیں ایک اور ٹرم ''ٹرانس جینک'' کو سمجھنا ہوگا۔ٹرانس جینک سے مُراد ہے جینز کا باہمی تبادلہ یعنی جینز کا ایسا تبادلہ جو ایک نوع سے کسی دوسری نوع کے درمیان (لیبارٹری میں) کیا جائے۔ایسی دو انواع کا آپس میں کسی بھی قسم کا قریبی ربط ضروری نہیں۔ایک بیکٹیریا اور ایک مینڈک کے درمیان بھی جینز کا تبادلہ کیا جاسکتا ہے۔ہم جانتے ہیں کہ بیکٹیریا ایک یونی سیلولر آرگنزم ہے جبکہ مینڈک ایک ملٹی سیلولر جاندار ہے۔لیکن ہم مینڈک کی خصوصیات کو بیکٹیریا میں یا بیکٹیریا کی خصوصیات کو مینڈک میں آسانی سے منتقل کرسکتے ہیں اور ایسے ٹرانسفر کو ہی ''ٹرانس جینک'' کہا جاتا ہے۔ایسا کرنے سے مخلوقات عالم میں کیا کچھ تبدیلیاں

---

[1] بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں منطق اور فلسفہ کے استاد۔عنوان ہمارا دیا ہوا ہے۔مدیر

واقع ہوسکتی ہیں اِن کا مکمل اندازہ لگانا ناممکنات میں سے ہے لیکن اب تک جو جو اندازے لگائے گئے ہیں وہ بھی کائنات کی تاریخ کے سب سے حیران کُن واقعات کہلانے کے بجاطور پر حق دار ہیں۔جن میں سے ایک یہ دعویٰ بھی ہے کہ ''بطور انسان یہ ہماری آخری صدی ہے''۔

اس وقت ترقی یافتہ دنیا کے دو بڑے ادارے ''ٹرانس جینک'' ریسرچ میں بے پناہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ایک مِلٹری اور دوسرا فارماسیوٹیکل انڈسٹری۔امریکن ملٹری اس وقت ''ٹرانس جینک ریسرچ'' کو فنڈ فراہم کرنے والے ٹاپ تھری اداروں میں شامل ہے۔اس سلسلے میں امریکی ملٹری کا ادارہ ''ڈارپا'' پیش پیش ہے۔ڈارپا (DARPA) سے مراد ہے، ''ڈیفنس ایڈوانس ریسرچ پراجیکٹس ایجنسی''۔ ڈارپا اب تک ملٹری کے مقاصد کے لیے کئی کامیاب تجربے کر چکی ہے۔انہوں نے ایک بکری ڈیزائن کی ہے جس کے ڈی این اے کے ساتھ مکڑی کا ڈی این اے ملایا گیا ہے۔ہم اِس ٹرانس جینک گوٹ کو''سپائیڈر گوٹ'' بھی کہہ سکتے ہیں۔اس بکری کی پیداوار سے اُن کا مقصد سپائیڈر سلک کا حصول ہے۔سپائیڈر سِلک جو مکڑی اپنے لعاب سے بناتی ہے۔ اِس تجربہ سے قبل صرف مکڑی کے لعاب سے ہی حاصل کیا جاتا تھا۔ یہ دنیا کا مضبوط ترین دھاگہ ہے جو نہ صرف ہر شئے سے ہلکا ہے بلکہ اس کی قوتِ برداشت اور لچک بھی دنیا کے ہر سِلک سے بہتر ہے۔بکری کے ساتھ مکڑی کے جینز کا اس طرح تبادلہ کیا گیا کہ ڈیزائن شدہ بکریاں اب ایسا دودھ دیتی ہیں جس میں ایک اضافی پروٹین سپائیڈر سلک فراہم کرتی ہے۔جو سِلک مکڑیوں سے حاصل کیا جاتا تھا اب وہ بکری کے دودھ سے حاصل کیا جارہا ہے اور یوں امریکی آرمی نے اپنے لیے نئے، ہلکے پھلکے بُلٹ پروف جیکٹس، نئے پیراشوٹس، نئے رسّے، نئے بیگز اور نئے جال (کارگونیٹس) بنالیے ہیں جو بڑے سے بڑا بوجھ اٹھانے پر بھی نہیں ٹوٹتے۔حوالہ کے لیے دیکھیے:

http://www.bbc.com/news/science-environment-16554357

چنانچہ یہ ایک ثبوت ہے اس بات کا کہ مختلف انواع کے ڈی این اے کے مختلف ٹکڑے کاٹ کر ایک دوسرے میں یوں لگائے جاسکتے ہیں جیسے ہم دو مختلف درختوں کی الگ الگ قلمیں آپس میں جوڑ کر ایک تیسرا نیا درخت اپنے گھر میں پیدا کر لیتے ہیں۔سپائیڈر گوٹ کے بعد سے اب تک ٹرانس جینک پروڈکٹس کہیں زیادہ آگے بڑھ چکی ہیں۔اور ایسی زیادہ تر پروڈکٹس کے

لیے امریکن ملٹری کا ادارہ ''ڈارپا'' لاکھوں ڈالرز کے فنڈز مہیا کر رہا ہے۔

دوسرا ادارہ جو ''ٹرانس جینک'' سائنس کو فنڈز دے رہا ہے وہ ملٹری سے بھی زیادہ اہم ہے اور وہ دنیا بھر میں اس ریسرچ کے لیے فنڈز دینے والا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ میرا اشارہ فارما سیوٹیکل انڈسٹری کی طرف ہے۔ فارما سیوٹیکل انڈسٹری کو سب سے زیادہ دلچسپی ''نیوڈرگ تھراپیز'' کے ساتھ ہے۔ انسانوں کے لیے نئے نئے علاج دریافت کرنے اور انسانی صحت کو بہتر سے بہتر بنانے کے مقاصد کے لیے کون فنڈز نہیں دے گا؟ ڈرگ تھراپیز کے لیے ٹرانس جینک ریسرچ کا پراسیس بہت لمبے راستے سے ہوکر آتا ہے۔

دراصل فارماسیوٹیکل لیبارٹریز کو ہمیشہ ٹیسٹنگ کا مسئلہ درپیش رہا ہے۔ وہ جب بھی کوئی نئی دوا بناتے ہیں تو اس کا کسی انسان پر پہلا تجربہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ انہیں اس کام کے لیے بہت پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ امریکہ میں انہیں ایف ڈی اے سے اجازت لینا پڑتی ہے جو کہ ایک لمبا اور صبر آزما سلسلۂ مراحل ہے۔

چنانچہ فارماسیوٹیکل انڈسٹری کے پیسے سے ٹرانس جینک ریسرچ کے ماہرین جو کام کر رہے ہیں اس کے پہلے حصہ میں وہ انسانی ڈی این اے اور کسی جانور کے ڈی این اے کے ملاپ سے ایسا جانور پیدا کرتے ہیں جس میں مخصوص انسانی کوالیٹیز ہوتی ہیں۔ وہ مخصوص انسانی کوالٹیز اس لیے پیدا کی جاتی ہیں کہ ان اجزاء یا اعضاء کو جو انسانی ہیں، نئی ادویات کی ٹیسٹنگ کے لیے جانوروں پر آزمایا جا سکے۔ اور اس طرح انسانی جان کو ٹیسٹنگ کے مراحل سے بلاخوف وخطر بچایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ فارماسیوٹکل انڈسٹری کی بہت زیادہ دلچسپی ''سٹیم سیل لائینز'' Stem Cell Lines پیدا کرنے میں ہے۔

ٹرانس ہیومن ازم کیا ہے؟ یہ ایک عالمگیر کلچرل تحریک ہے۔ جس کا نصب العین ٹرانس ہیومنز Trans-humans پیدا کرنا ہے۔ یہ بنیادی طور پر دنیا کی توجہ اس آئیڈیا کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ کہ سائنس کی مختلف فیلڈز کے ملاپ سے ہم جلد (زیادہ سے زیادہ بیس سالوں میں) اس قابل ہوں گے کہ لفظ ''انسان'' کی بنیادی تعریف اور تصور کو ہمیشہ کے لیے تبدیل کر سکیں۔ اب محاورۃً نہیں بلکہ حقیقتاً ہم اب انسانی ڈی این اے کی لینگوئج کو دوبارہ لکھ سکنے کے قابل ہو چکے ہیں۔ ہم محض اپنا جینٹک میک اَپ تبدیل کر کے اپنے آپ کو ایک زیادہ ارتقاء یافتہ

نوع میں بدل سکتے ہیں۔ہم ہیومینز یعنی ہوموسیپینز کا ورژن 0.2 تخلیق کرنے پر قادر ہو چکے ہیں۔اس تحریک کو عام طلبہ یا اساتذہ میں ایچ پلس (H+) کے نام سے جانا جاتا ہے،جس کا معنی ہے ہیومنز پلس۔ٹرانس ہیومنز اصل میں ایسے انسان ہوں گے جنہیں ہم ''ٹرانزیشنز'' کہہ سکتے ہیں یا اس سے بھی بہتر نام ہوگا،''پوسٹ ہیومینز''۔اور جب ٹرانس ہیومنز سے زمین بھر جائے گی تو پھر ہم....جو اِس وقت ہیں یعنی ہماری موجودہ انسانی ساخت اور ہیئت مزید انسانی ساخت اور ہیئت کہلانے کی اہل نہیں رہے گی۔یہ انسانی سطح سے کم تر سطح کہلائے گی۔ہر وہ انسان جو نارمل ہوگا وہ ٹرانس ہیومینز کے مقابلے میں بالکل ایسے ہوگا جیسے آج ہمارے مقابلے میں بن مانس یا چیمپیئنز ہیں۔

ان کے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ قدرت نے ہر نوع کے جانداروں کو الگ الگ خصوصیات سے نوازا ہے مثلاً عقاب،شاہین،شکرا اور اس کلاس کے تمام پرندے،بہت زیادہ تیز نظر کے مالک ہوتے ہیں۔وہ میلوں دور تک یوں صاف دیکھ سکتے جیسے ہم اعلیٰ کوالٹی کی دوربین کے ساتھ دیکھتے ہیں۔اِسی طرح کتے کو فطرت کی طرف سے طاقتور قوتِ شامہ عطا کی گئی ہے۔کتا چالیس ہزار ہرٹز کی کی آواز سن لیتا ہے۔ڈالفن غالباً اسی ہزار ہرٹز کی آواز سن لیتی ہے۔بلی اور چیتے کے پٹھے (Muscles) حیران کن حد تک لچکدار ہیں۔بلی اونچی سے اونچی چھت سے چھلانگ لگانے کے بعد آرام سے اُٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔شیر میں نسبتاً بے خوفی سب جانوروں سے زیادہ پائی گئی ہے اور اسی وجہ سے شیر دل انسان سے مراد بہت بہادر انسان لی جاتی ہے۔اونٹ میں قوتِ برداشت اور استقامت وافر مقدار میں موجود ہے۔غرض ہر جاندار کسی نہ کسی خصوصی انعام سے نوازا گیا ہے۔چھوٹے چھوٹے جانداروں یعنی جرثوموں سے لے کر بڑے بڑے جانداروں جیسے ہاتھی تک سب کے جینز ہمارے لیے بڑے قیمتی ہیں۔ان تمام جینز کو انسانی جینز کے ساتھ ملا کر ایسے انسان پیدا کیے جا سکتے ہیں جو عقاب جیسی تیز نظر،کتے جیسی تیز قوتِ شامہ،شیر جیسے دل،چیتے جیسی چستی،بلی جیسی لچک،ہاتھی جیسی حساسیت یا کسی بھی جاندار کی خصوصی صلاحیت کا اکیلا اور یکتا حامل ہوگا۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر Nick Bostrom نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں لکھا ہے کہ دیگر مخلوقات اِس کائنات کے بعض ایسے رازوں سے واقف ہیں جن سے ہم انسان اپنے محدود حواس کی وجہ سے واقف نہیں ہو سکتے۔مثال کے طور پر بعض جانور زلزلے سے

پہلے جان جاتے ہیں کہ زلزلہ آنے والا ہے۔ بعض جانور طوفان آنے سے پہلے جان جاتے ہیں کہ طوفان آنے والا ہے۔ اسی طرح جانوروں کو کئی دفعہ دیکھا گیا ہے کہ وہ بغیر کسی وجہ کے مشتعل ہو جاتے ہیں۔ کتے بلا وجہ بھونکنے لگ جاتے ہیں، یا ڈر جاتے ہیں اور بلا وجہ چارپائی کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یقیناً ان کے وژن ڈفرنٹ ہونے کی وجہ سے وہ بعض ایسی چیزیں دیکھ لیتے ہیں جو ہم انسان اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ جنگلی جانوروں میں رات کو دیکھنے کی صلاحیت ہے لیکن ہم انسان بغیر روشنی کے رات کو نہیں دیکھ سکتے۔

ٹرانس ہیومنسٹس تحریک کا کہنا ہے کہ ''ٹرانس ہیومینز'' ایسے انسان ہوں گے جن کو ان تمام صلاحیتوں سے آراستہ کیا جائے گا۔ اور اس پراسیس میں یہ ضروری نہیں کہ ہر ایسا انسان شروع میں بچہ ہو۔

ایک ٹرانس ہیومن بننے کے لیے بعض تبدیلیاں ایسی بھی ہیں جو اب اِس وقت موجود انسانوں کو بعض ''ٹرانس جینک ادویات'' یا خوراکیں کھلانے سے بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ٹرانس ہیومنسٹس اس بات کے حق میں ہیں کہ انسان کے حواس کو عقابوں، کتوں اور دیگر جانوروں کے حواس سے بہتر ہونا چاہیے۔ انسان کا حق ہے کہ وہ قدرت کے چھپے ہوئے رازوں کو جانے اور بہتر سے بہتر زندگی گزارے چنانچہ یہ صرف ٹرانس ہیومن ازم ہی ہے جو انسانوں کو ایسا بلند مرتبہ بلا تردد دلا سکتا ہے۔

ٹرانس ہیومنز پیدا کرنے کے لیے صرف بیالوجی اور جینٹکس کے سائنسدان ہی مصروفِ عمل نہیں ہیں بلکہ ٹرانس ہیومن ازم کی بنیادی تعریف میں ہی انٹرڈسپلنری ریسرچ شامل ہے۔ اس میں نیورو فارماکالوجی، نینو ٹیکنالوجی، جینٹک انجینئرنگ، سٹیم سیل سائنسز، روبوٹک اسسٹنس، برین مشین انٹرفیسنگ یعنی تقریباً سائنس کی تمام نئی شاخیں جو انسانی جسم کی ساخت اور صلاحیتوں کو بہتر بنانے میں ساتھ دے سکتی ہیں ٹرانس ہیومن ازم کی تحریک میں شامل ہیں۔

ٹرانس ہیومنسٹس تحریک غیر قدرتی تیزی کے ساتھ دنیا میں پھیل رہی ہے۔ ابھی اس تحریک کا آغاز ہوئے چند ہی سال ہوئے ہیں لیکن یہ اس وقت تقریباً دنیا کے ہر ملک، ہر قوم اور تمام بڑے مذاہب میں موجود ہے۔ کالج سے یونیورسٹی لیول تک اور بازار سے لے کر ویران جزیروں پر لیٹے ہپّیوں تک سب اس تحریک میں نہایت تیزی کے ساتھ شامل ہو رہے ہیں۔ کئی مذاہب نے آئندہ دو عشروں میں برپا ہونے والی ٹرانس جینک قیامت کا خطرہ بھانپ لیا ہے اور اپنی اپنی

تحریکیں بنا لی ہیں۔ اس وقت دنیا میں ''کرسچین ٹرانس ہیومنسٹ سوسائٹی''، ''بدھسٹ ٹرانس ہیومنسٹس ایسوسی ایشن'' اور ''جیوش ٹرانس ہیومنسٹ ایسوسی ایشن'' موجود ہے۔ اس دوڑ میں کوئی ملک کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا اور کوئی مذہب بھی آنے والے وقت میں فنا نہیں ہونا چاہتا۔ ان تحریکوں کے لیڈرز نے بھانپ لیا ہے کہ آنے والے طوفان کے راستے میں بند باندھنے سے بہتر ہے کہ ''تم سب سے پہلے ٹرانس ہیومنز بنا جاؤ!''۔ ان تمام ایسوسی ایشنز نے مل کر ایک ورلڈ وائیڈ ایسوسی ایشن ''ورلڈز ٹرانس ہیومنز سوسائٹی'' کے نام سے بنالی ہے جس کے صدر ڈاکٹر جیمز ہیوز (Dr. James Hughes) ہیں۔

ٹرانس ہیومنسٹس کا خیال ہے کہ وہ تیزی سے کامیابی کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے اپنی تحریک کا نام بدل کر آئی ای ای ٹی (IEET) رکھ لیا ہے۔ جو ''انسٹی ٹیوٹ فار ایتھکس اینڈ ایمرجنگ ٹیکنالوجی'' کا مخفف ہے۔ ڈاکٹر جیمز ہیوز اب آئی ای ای ٹی کا صدر اور سی ای او ہے۔ دنیا کے چند بڑے نامور سائنسدان اور بااثر لوگ اس تحریک میں شامل ہو چکے ہیں۔ مثلاً آکسفورڈ یونیورسٹی میں آئی ای ای ٹی کے چیرمین پروفیسر ڈاکٹر نِک باسٹرام (Nick Bostrom) ہیں۔ حال ہی میں رائل سوسائٹی آف سائنسز نے ایک سیمینار کا انعقاد کیا جس کا عنوان تھا ''کیا ہم کائنات میں اکیلے ہیں؟''۔ اس سیمینار میں ٹرانس ہیومنسٹ تحریک کے عالمی صدر ڈاکٹر جیمز ہیوز نے بہت تفصیل کے ساتھ اس خیال پر روشنی ڈالی کہ مستقبل میں ہم ٹرانس ہیومنز کے ذریعے کائنات کا سفر بہت آسان کرنے والے ہیں۔ ایسے انسان ڈیزائن کرنے پر غور کیا جا رہا ہے جو زیرو گریویٹی میں کام کر سکیں اور اسی طرح کے دیگر مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم سپیس سائنس کے لیے خصوصی ٹرانس ہیومنز پیدا کرنے والے ہیں۔

ٹرانس ہیومنسٹس تحریک بہت مضبوط اور بہت سیریس تحریک ہے اور پوری دنیا اِسے بہت سیریس لے رہی ہے۔ کالجز، یونیورسٹیز، دیگر ریسرچ ادارے اور بہت سے اہل علم بہت تیزی کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ اس وقت دنیا کا ملینز نہیں، بلینز بلکہ ٹریلینز ڈالرز اس تحریک کی بدولت ٹرانس ہیومنز پیدا کرنے پر لگا ہوا ہے۔

ٹرانس ہیومینز پیدا کرنے کے لیے کتنے اور کس کے فنڈ ز استعمال ہو رہے؟

اگر آپ گوگل میں ''Trans-humanism'' کا لفظ ٹائپ کریں تو آپ کو دو لاکھ پچاس

ہزار نیٹ پیجز نظر آئیں گے جو ٹرانس ہیومن ازم کے لیے وقف ہیں۔لیکن اگر آپ گوگل میں ''Genetic Engineering Laboratories'' کے الفاظ ٹائپ کریں تو آپ چوبیس ملئین ویب سائیٹس تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں۔یہ سب لوگ تقریباً اسی مشن پر لگے ہوئے ہیں۔

امریکہ میں جارج ڈبلیوبش نے ۲۰۰۶ء میں سٹیٹ آف دایونین ایڈریس میں ایک قانون کی منظوری کے لیے سفارش کی جس کے بعد انسانوں اور جانورں کے درمیان ''ٹرانس جینک'' سرگرمیوں پرمکمل پابندی عائدکردی گئی۔یہی بات لمحۂ فکریہ ہے کہ امریکہ جیسے ملک کا صدر آخرکسی ٹیکنالوجی کو مکمل طور پر بند کرنے کے لیے آن دی ریکارڈ اجلاس میں تقریر کیوں کرے گا؟ یقیناً خطرہ بہت بڑا تھالیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے صدراوباما نے جو پہلا کام کیا وہ یہی تھا کہ اُس نے صدربُش کی طرف سے ٹرانس جینک ریسرچ پر لگائی گئی تمام پابندیاں یکسر اُٹھادیں۔اور اس طرح سب سے بڑامرحلہ یہ طے ہوگیا کہ سرکاری رقوم کا راستہ ٹرانس جینک ریسرچ کی طرف کھل گیا۔اور یوں امریکہ کی ٹیکس پیئر رقوم کا مہیب ریلا اس عظیم اور محیر العقول ریسرچ کی طرف بہہ نکلا۔یہ پیسہ ہزاروں لیبارٹریز کو جارہا ہے۔جو بات دنیا کے کسی بھی انسان کو بے پناہ پریشان کرسکتی ہے وہ یہ ہے کہ امریکی ریسرچ کا یہ پیسہ ایک بڑی مقدار میں جس ٹیکنالوجی پر صَرف ہونا شروع ہوگیا ہے، اسے سائنس کی زبان میں 'ہیومن اینمل کائمیرا' (Human Animal Chimera) کہتے ہیں۔جس کا مطلب ہے انسان اور جانوروں کے ملاپ سے پیدا کی جانے والی نئی نئی انواع۔یعنی ایسا جاندار جو ہیومن اینمل ہائی برڈ ہوگا۔آدھا انسان اور آدھا کوئی اور جانور۔اگرچہ ظاہراًایسا کچھ نہیں ہے اور ہیومین اینمل کائیمرا پیدا کرنے سے فقط مراد انسانی بہبود اور نیک مقاصد ہیں۔مثلاً آج ہم ٹرانسپلانٹیشن کے ذریعے دل بدلوا سکتے ہیں لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب کوئی ''دل دینے والا'' بھی موجود ہو۔اگر کسی نے بروقت دِل نہ دیا تو ہم مرجائیں گے۔کیونکہ ہمارا دل خراب ہوچکا ہے لیکن ہیومین اینمل کائیمرا کی شکل میں ہم ایسا جانور پیدا کرسکتے ہیں جس میں ہمارے لیے ایک عدد دل پیدا کیا جائے گا۔وہ کوئی جانور ہوگا۔ایسا جانور جیسے جانور ہم عموماً ذبح کرتے رہتے ہیں مثلاً وہ گائے، بکری یا بھیڑ ہوسکتی ہے جس کے سینے میں ہمارا دل ہوگا۔ہم اس جانور کو ذبح کرکے اپنا دل لے لیں گے اور یوں ہارٹ ٹرانسپلانٹیشن کے لیے ڈونیشن کے مسئلہ سے جان چھوٹ جائے گی۔مطلب کہنے کا یہ ہے کہ ظاہری طور پر تو ہیومین

اینمل کائمیرا کی پیداوار ایک مثبت اقدام ہے لیکن اس کے سائیڈ ایفیکٹس کا اندازہ لگانا ممکنات سے باہر ہے۔امریکہ کی ایک ریاست میں باقاعدہ ایک فارم ہے جہاں ایسے سؤر پیدا کیے جا رہے ہیں جو تھوڑے سے انسان اور باقی سؤر ہیں۔تھوڑے سے انسان اس طرح کہ ان سؤروں میں انسانی اعضاء پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ آرگن ٹرانسپلانٹیشن انڈسٹری کو حتمی مدد دی جاسکے۔ایک سؤر کے اندر انسانی ڈی این اے کا پھلنا پھولنا عجیب وغریب مظہر فطرت ہے۔ایٹم بم کی ایجاد نے ہیروشیما اور ناگاساکی کی جان لی تھی لیکن معلوم نہیں یہ ٹرانس جینک پروڈکٹس کیا گل کھلائیں گی؟ بظاہر اُمید ہی اچھی چیز ہے اور اچھی اُمید یہی کی جاسکتی ہے کہ بالآخر ٹرانس جینک پروڈکٹس انسان کی بھلائی کا ہی موجب بنیں گی۔

۲۰۰۶ء میں امریکہ کے سب سے بڑے ڈیپارٹمنٹ ، ڈیپارٹمنٹ آف ہیلتھ نے 10,00,773 ڈالرز محض صرف ایک مقصد کے لیے دیا کہ دوسال کے اندر اندر اس بات کا جائزہ لے کر بتایا جائے کہ ٹرانس جینک ریسرچ کی اخلاقی پوزیشن کیا ہے؟ اس ریسرچ کی اہمیت اس لیے زیادہ تھی کہ اس میں انسانی سبجیکٹ استعمال کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔یعنی براہِ راست انسانوں کو تجربات میں شامل کر کے بالآخر حکومت کو یہ بتایا جائے کہ اگر جینٹک انجینئرنگ اُن اہداف تک پہنچ جاتی ہے جن سے انسانیت خوفزدہ ہو رہی ہے تو انسان اور غیر انسان میں فرق کرنے کے لیے کیا اخلاقی قدریں مقرر کی جاسکیں گی؟ میکس میہل مین Max Mehlman اس پراجیکٹ کا سربراہ تھا۔لیکن عجیب بات یہ ہے کہ دوسال کا عرصہ پورا ہونے کے بعد کوئی رپورٹ شائع نہ کی گئی اور ریسرچ کے نتائج کو چھپالیا گیا البتہ کچھ ہی عرصہ بعد ریسرچ لیڈر ''میکس میہل مین'' نے امریکہ کی ایک ایک یونیورسٹی میں جا کر ''ڈائریکٹڈ ایوولیوشن'' اور ''ٹرانس ہیومن ازم اور جمہوریت'' کے عنوان سے لیکچرز کا سلسلہ شروع کر دیا۔ڈائریکٹڈ ایوولیوشن سے معنوی طور پر یہی مراد ہے کہ انسان کی ہدایت پر چلنے والا ارتقاء۔کیونکہ اس سے پہلے ارتقاء،فطرت کی ہدایات پر چل رہا تھا۔میکس کے لیکچرز کے عنوانات سے مترشح ہے کہ لیبارٹری میں نتائج توقعات سے کہیں زیادہ پریشان کن برآمد ہوئے تھے۔

صرف ایک ملک، امریکہ میں ہی اتنے بڑے بڑے حکومتی ادارے خود ٹرانس جینک ریسرچ کو بڑی بڑی رقوم دے رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بہت جلد نسلِ انسانی اپنی موجودہ

ساخت سے کچھ اور بننے والی ہے۔

ہم نے اب تک جتنی گفتگو کی اس سے فقط اتنا تاثر ملتا ہے کہ چلو! یہ لوگ جب کچھ پیدا کرینگے تو دیکھ لیں گے! لیکن یہ بات ہم بھول رہے ہیں کہ جینیٹکلی انجینئرڈ خوراک بھی اتنی ہی تبدیلی کنندہ ہے جتنا کہ نئی نوع کو پیدا کردینے والے عناصر۔ جیسا کہ پولیو کی ویکسین کے ذریعے روئے زمین سے پولیو کا خاتمہ کرنے کی مہم محض قطرے پلا کر چلائی گئی ہے اور اب تقریباً پولیو فنا ہونے ہی والا ہے بالکل اسی طرح محض قطرے پلا کر بھی ہمیں جینیٹکلی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہے اصل فکرمندی کا مقام۔

اسی طرح امریکن ملٹری کے ادارہ ''ڈارپا'' کا میں نے پہلے ذکر کیا۔ ڈار پا بلینز آف ڈالرز صَرف کر رہا ہے اور اس کے کئی پروجیکٹس پر بیک وقت کام جاری ہے۔ جن میں سے ایک پروجیکٹ کا نام ہے ''ایکسٹینڈڈ پرفارمینس وار فائٹر''۔ نام سے ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ عام سپاہیوں کو جینیٹکلی ڈیزائن کرنے کا منصوبہ ہے۔ اس پروگرام کے اوریجنل ڈاکومینٹس نیٹ پر دستیاب ہیں جن میں واضح لکھا ہے کہ سولجرز کے ڈی این اے میں تبدیلی کرنا اس پروگرام میں شامل ہے۔ امریکی عوام نے اسے ''سپر سولجر ٹیکنالوجی'' کا نام دے رکھا ہے۔ ۲۰۱۱ء میں ڈارپا نے ملینز آف ڈالرز کا بجٹ پھر منظور کیا اور جس پروگرام کے لیے منظور کیا اس کا نام ہے، ''بائیو ڈیزائن''۔ بائیو ڈیزائن حقیقت میں فقط ایک آؤٹ لائن ہے تاکہ بجٹ منظور کیا جا سکے ورنہ فی الحقیقت یہ پراجیکٹ ''لافانیت'' کے نام سے شہرت پکڑ رہا ہے کیونکہ اس پراجیکٹ کے تحت انسانی عمر بڑھانے کے لیے ٹرانس جینک ریسرچ کی جا رہی ہے۔ اس پراجیکٹ کے ابتدائی مقاصد میں سیل کی تخریب و تعمیر کا اس نقطہ نگاہ سے مطالعہ مقصود ہے کہ آخر انسانی سیل ختم ہونا اور مرنا کیوں شروع ہو جاتے ہیں۔ ایسا کیوں نہیں ہے کہ ہم عمر کے ایک حصہ کے بعد جسم کے تمام سیلز کی دوبارہ پیدائش کے قابل ہو سکیں۔ اس عمل کی وضاحت کے لیے ''ڈارپا'' خود جو اصطلاح استعمال کر رہا ہے وہ ہے، ''کری ایٹنگ اِمارٹل آرگانزم''(Creating Immortal Organisms) لیکن یہ نام بھی اس کی حدود کی ٹھیک سے وضاحت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ملٹری دراصل اس پراجیکٹ کے ذریعے اپنے فوجیوں میں ایک ''ایبی لیتھل فورس'' پیدا کر دے گی جو تباہ کن ہوگی۔ اس طرح ان کے فوجی حد سے زیادہ طاقتور اور باصلاحیت ہو جائیں گے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ ٹیکنالوجی فقط امریکہ تک محدود نہیں ہے بلکہ آسٹریلیا، چین، برطانیہ سمیت پوری دنیا میں ہزارہا لیبارٹریز ہیں جہاں جینٹک انجینئر نگ پر دن رات تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ گزشتہ دنوں برطانیہ میں یہ بحث زور پکڑ گئی تھی کہ ''ہیومین اینمل کائمیرا'' یا ''ہیومن اینمل ہائی برڈ'' پیدا کرنا اخلاقی طور پر کس حد تک درست یا غلط ہے؟ دراصل برطانوی حکومت نے اس بحث کو عوام کے سامنے جان بوجھ کر رکھا۔ برطانیہ کے سائنس دان یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کے عوام انہیں اس تحقیق میں کس تک آگے جانے دینا چاہتے ہیں؟ کئی مباحث اور سیمینار منعقد کیے گئے۔ اسی طرح کے ایک بڑے سیمینار میں ویٹیکن کے دو بڑے بسشپس بھی شریک ہوئے۔ انہوں نے اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ فرض کریں ایک عورت ٹرانس جینک پروڈکشن میں حصہ لیتی ہے اور اس کے انڈے سے ایک ایسا بچہ پیدا کیا جاتا ہے جو کچھ انسان اور اس کا باقی حصہ کوئی اور جانور ہے اور پھر وہ عورت بعد میں اپنے فیصلے پر پچھتاتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کا بچہ ختم کر دیا جائے کیونکہ وہ اپنے بچے کو اس حال میں نہیں دیکھنا چاہتی تو پھر اسے اس بچے کو ختم کر دینے کا اختیار دینا بھی اخلاقی طور پر فرض ہو جائے گا۔ ایسے مباحث میں ایک بات کھل کر سامنے آگئی کہ ہیومین اینمل کائمیرا میں یہ طے کرنا ایک مستقل سوالیہ نشان ہے کہ ''کتنا انسان اور کتنا حیوان؟'' یعنی کوئی بھی کائمیرا جو بظاہر دیکھنے میں محض ایک سؤر ہے، آخر کس حد تک انسان ہے۔ اس کے جسم میں کون کون سے اعضاء انسانی ہیں اور اسے کتنے فیصد انسان مانتے ہوئے اس پر انسانی حقوق لاگو کیے جا سکتے ہیں؟ ایک بات جس سے دنیا کے عوام ابھی تک بے خبر ہیں وہ یہ ہے کہ انسان اور حیوان کے درمیان کی جانے والی یہ اینٹیگریشن کتنے فیصد ہے؟ یعنی کیا واقعی ایسا ہے کہ دل گردے یا پھیپھڑوں کی حد تک انسان اور باقی ماندہ جانور ملا کر نئی انواع پیدا کی جا رہی ہیں یا انسان اس مقدار سے زیادہ ان میں شامل ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سائنسدان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ففٹی پرسینٹ اینٹیگریشن کر رہے ہیں۔ یعنی پچاس فیصد انسان اور پچاس فیصد دوسرے حیوانات کو ملایا جا رہا ہے اور یہ ایک نہایت توجہ کھینچنے والا امر ہے۔

اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اس کام کو روکا جائے یا چلتے رہنے دیا جائے؟ اس پر پیسہ خرچ کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کام کو اب روکا ہی نہیں جا سکتا۔ کسی بھی قیمت پر، کوئی بھی طاقت ایسی نہیں جو جینٹک انجینئرنگ کے خوفناک نتائج سے انسانوں کو باز رکھ سکے۔

کیونکہ یہ ایٹم بم بنانے جتنا مشکل کام نہیں ہے کہ پوری صدی گزرنے کے بعد بھی چند ممالک کے پاس وہ صلاحیت ہوگی، یعنی ایٹم بم بنانے کی صلاحیت۔ بلکہ جینٹک انجینئرنگ کی لیبارٹری تو آپ اپنے مکان کے گیراج میں بھی کھول سکتے ہیں۔ چنانچہ انسانوں اور جانوروں کے پیش آمدہ ''قلمی'' تعلق کو روکنا ممکن ہی نہیں۔ اور اس لیے امریکہ سمیت اب تمام اقوام کی یہ سوچ ہے کہ پھر کیوں نہ وہ سب سے پہلے اس ٹیکنالوجی کا استعمال کریں اور خود کو ٹرانس ہیومینز میں تبدیل کرلیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ اگر ان کے دشمنوں نے خود کو اُن سے پہلے ٹرانس ہیومنز بنالیا تو وہ اپنے دشمنوں کے مقابلے میں غیر ارتقاء یافتہ مخلوق کے طور پر کمزور رہ جائیں گے۔

ٹرانس ہیومن ازم کے فوائد میں سب سے پہلا اور سب سے بڑا فائدہ ہے ''لمبی عمر''۔ ٹرانس ہیومینز لمبی عمروں کے مالک ہوں گے۔ ڈاکٹر آبرے ڈی گرے (Dr. Aubrey De Grey) کا دعویٰ ہے کہ وہ لوگ جو اس وقت پچاس سال کے ہیں، ان میں بیشتر لوگ اب ایک ہزار سال تک نہیں مریں گے۔ ڈاکٹر آبرے آنے والے ٹرانس جینک انقلاب کی وجہ سے ایسا کہہ رہا ہے۔ لیکن ٹرانس ہیومنز صرف لمبی عمروں کی وجہ سے ہی منفرد نہیں ہوں گے کیونکہ لمبی عمر ہونا کوئی زیادہ بڑا فائدہ یا زیادہ دلچسپ بات نہیں ہے۔ بعض لوگ تو لمبی عمر کو ایک عذاب خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں ایک ہزار سال تک اس دنیا کی مشکلات کا سامنا کرنا فائدے کی بات نہیں بلکہ مصیبت ہے۔ ٹرانس ہیومنسٹس اس بات کا بھی پورا دھیان رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ صرف لمبی زندگی ہی نہ ہوگی بلکہ یہ ایک خوشحال زندگی بھی ہوگی۔ یہ زیادہ صحت مند زندگی ہوگی۔ یہ زیادہ ذہین زندگی ہوگی۔ یہ زیادہ باشعور زندگی ہوگی۔ مثلاً نیوروسائنسز کے ذریعے ہم اب بہت سی نئی چیزیں سیکھ رہے ہیں۔ ہم اب جانتے ہیں کہ دماغ کے وہ کون سے حصے ہیں جہاں ''ڈپریشن''، ''یوفوریا'' اور ''اینگزائٹی'' کا عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ایک ٹرانس ہیومن کے ایسے حصوں کو جینیٹیکلی ڈویلپ کردیا جائے گا تاکہ وہ کبھی ڈپریس نہ ہوں۔ کبھی پریشانی اور فکرمندی کا شکار نہ ہوں۔ وہ ہزاروں سال جیئیں گے لیکن ہمیشہ خوش رہیں گے۔ شعوری صلاحیتوں میں بھی ایک ٹرانس ہیومین لاجواب ہوگا۔ ایک طرف تو اس کی منطقی قابلیت سقراط اور ارسطو جتنی ہوگی اور دوسری طرف اس کی سائنٹفک تفہیم کی سطح آئن سٹائن جتنی ہوگی۔ ٹرانس ہیومینز کے دماغ کمپیوٹرز کے ساتھ جڑنے اور الگ ہونے کی صلاحیتوں کے مالک ہوں گے۔ وہ براہِ راست اپنے دماغ

سے کمپیوٹر میں چیزیں اپ لوڈ اور ڈاؤن لوڈ کر سکیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ ذہن اور دماغ کے علاوہ جسمانی فوائد کے اعتبار سے ہم انسان بہتر سے بہتر شکل وصورت اور صلاحیتیں حاصل کر لیں گے خاص طور پر جسمانی طاقت۔ مثلاً آج ایک ساٹھ سال کا شخص اگر سو قدم دوڑے تو اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے لیکن ایک عام ٹرانس ہیومین ایک سو پچاس سال کی عمر میں اتنا طاقتور ہوگا کہ اولمپک ریس کے مقابلے میں حصہ لے اور جیت سکے۔

سب سے الگ اور سب سے منفرد فائدہ جو سائنسدانوں کو نظر آ رہا ہے وہ ہے ''پوسٹ جینڈر رزم''۔ پوسٹ جینڈر رزم بنیادی طور پر فیمنسٹوں نے متعارف کروایا ہے۔ خاص طور پر فیمنسٹس کا یہ خیال کہ ہمیشہ عورتیں ہی کیوں پریگننٹ ہوتی ہیں۔ مرد کیوں پریگننٹ نہیں ہوتے؟ فیمنسٹ تحریکوں کی طرف سے ایسے عجیب وغریب بیانات جاری ہوتے رہتے ہیں کہ سائنس کو مردوں میں اوور یز کا اضافہ کرنے کی طرف عملی طور پر غور کرنا چاہیے تا کہ مستقبل میں عورت اس عذاب کی اکیلی شکار نہ ہو بلکہ اگر بچہ مرد کے پیٹ سے پیدا کرنا طے پائے تو پھر مرد بھی بچہ پیدا کر سکے۔ اسی نظریہ کو لے کر بعض ٹرانس ہیومینسٹس یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بہترین عورت اور بہترین مرد کے ملاپ سے ایسا بہترین ٹرانس ہیومین پیدا کیا جا سکتا ہے جس میں مرد وزن کی عدم مساوات کے خاتمے کے ساتھ ساتھ دونوں کی مشترکہ صلاحیتوں سے انسانیت کے لیے مشترکہ فوائد حاصل کیے جا سکیں۔ ایسا ٹرانس ہیومین دونوں ہوگا یعنی عورت بھی اور مرد بھی۔ دوسرے ٹرانس ہیومینز انسان کے پیٹ سے بچے کے پیدا ہونے کے سرے سے مخالف ہیں۔ وہ مرد وزن کو نو ماہ بچے کا بوجھ اُٹھانے سے بھی آزاد کرنے کے حق میں ہیں۔ ایک، دو، تین یا زیادہ انسانوں کے مشترکہ ڈی این اے سے بھی ایک بچہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جس میں سب کے ڈی این اے کی خصوصیات ڈالی جا سکتی ہیں۔ ٹرانس ہیومنسٹس کا خیال ہے کہ آنے والے وقت میں دو لوگوں کی بجائے چار لوگوں یا بیس لوگوں کے درمیان شادی کے معاہدے طے پائے جانے کے امکانات بھی واضح ہیں جو کسی ایک بچے میں اپنی مختلف خصوصیات منتقل کرنے پر رضامند ہوں گے اور وہ سب اس بچے کے والدین شمار کیے جائیں گے۔ اس طرح کے ڈیزائن کا پہلا کامیاب تجربہ برطانیہ میں انجام دیا جا چکا ہے جس میں ایک بچے کے تین والدین ہیں اور تینوں نے اس بچے میں اپنے حصے کا ڈین این اے شیئر کیا ہے۔ یہ پہلا انسان نہیں ہے جو جینیٹیکلی انجینئرڈ ہے۔ تفصیل

کے لیے دیکھیے:

http://www.dailymail.co.uk/…/Designer-baby-parents-heredita

ٹرانس ہیومنسٹس کا کہنا ہے کہ عورت کے پیٹ کی بجائے بچے کو مصنوعی انڈے یا مصنوعی اووری میں نشوونما دی جا سکے گی اور عورتوں کو بچہ پیدا کرنے کے لیے نو ماہ تک اس کا بوجھ نہیں اُٹھانا پڑیگا۔ یہاں ایک سائیکالوجسٹ سوال کر سکتا ہے کہ ایک بچہ جو نو ماہ ماں کے پیٹ میں رہتا ہے وہ ماں کے ساتھ ایک خاص رشتے میں جڑا ہوتا ہے۔ایک بچہ جو ابھی ابھی پیدا ہوا وہ اپنی ماں کی آواز کو پہچان سکتا ہے۔لیکن اس سوال کا جواب ''پوسٹ جینڈرسٹس'' یہ دیتے ہیں کہ ماں کے پیٹ میں رہنے سے بچہ جن جن قدرتی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے وہ صلاحیتیں مصنوعی انڈے میں پیدا ہونے والے بچے کے اندر بھی ہو بہو موجود ہوں گی۔ بچے کی پیدائش کے فیصلے کے ساتھ ہی اس کے والدین کے جینز کے وہی اجزاء لیے جائیں گے جو والدین چاہیں گے۔ اگر والدین چاہتے ہیں کہ بچہ فطری طور پر اپنی ماں کو پہچاننے کی صلاحیت کے ساتھ پیدا ہو تو مصنوعی انڈے میں پرورش پانے والا بچہ بھی اپنی ماں کی آواز کو پہچاننے کی صلاحیت کے ساتھ پیدا ہوگا۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اب بچے کی پیدائش کے لیے نو ماہ کا عرصہ بھی ضروری نہ ہوگا۔ بچہ اس سے کہیں کم عرصہ میں مکمل ہو جائے گا اور جونہی ماں باپ اسے لینے ہسپتال جائیں گے اور مصنوعی انڈے کا سوئچ آف کیا جائے گا تو بچہ پیدا ہو جائے گا اور وہ بالکل ویسے ہی پیدا ہوگا جیسے اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔

ٹرانس ہیومن ازم کلوننگ سے کہیں آگے کی بات ہے۔ یہ صرف کلوننگ کے ذریعے بچے پیدا کرنے کا پروگرام نہیں ہے۔ کلوننگ اس کے مقابلے میں کلاسیکی عہد کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ٹرانس ہیومن ازم انسان اور جانوروں کے ملاپ سے نئے انسان کی پیدائش کی بات کرتا ہے۔

ایک اور بڑا فائدہ جو ٹرانس ہیومنسٹس سوچ رہے ہیں وہ مجھے اپنی ماہیت میں سب سے زیادہ اہم محسوس ہوا۔ یہ لگ بھگ سپر نیچرل صلاحیتوں کے حصول کی بات جا بنتی ہے۔ اس بات کا ذکر میں اسی مضمون میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ اس نظریہ کا بانی ڈاکٹر نک باسٹرام ہے۔ اس کا تھیسز ''ٹرانس ہیومنز ویلیوز'' کے موضوع پر ہے۔ اور یہ اس کی ویب سائیٹ پر موجود ہے۔ دیکھیے:

http://www.nickbostrom.com/

ڈاکٹر باسٹرام اس وقت دنیا کے کئی بڑے ملکوں کی یونیورسٹیز میں اسی موضوع پر لیکچرز دے رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے دلائل کی زبان مذہبی نہیں رکھی لیکن انہوں نے ایک چارٹ کے ذریعے قوت متصورہ (پرسپشنز) کی تمام اشکال کی وضاحت کردی ہے۔ جن میں انسان، پوسٹ ہیومینز، ٹرانس ہیومینز اور حیوانات سب کے لیے الگ الگ ڈومینز مقرر کر کے نہایت منطقی قضیات قائم کیے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ انسان اور فوق البشر کا امکان جینٹک انجینئرنگ کے ذریعے بہت قوی ہے۔

اس نے ڈالفن، کتوں اور چمگادڑوں کے ڈی این اے کے انسانوں کے ساتھ ملاپ کی صورت میں حیران کن نتائج کا اعلان کیا ہے۔ ہاتھیوں کے جینز کے ذریعے انسانوں میں ارتعاش کو پہچاننے کی صلاحیت بڑھائی جاسکتی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ جانوروں کو زلزلوں سے پہلے معلوم ہوجاتا ہے کہ زلزلہ آنے والا ہے۔ جانور کیسے جان جاتے ہیں کہ کوئی قدرتی آفت آنے والی ہے؟ انسان کا حق ہے کہ اس کے پاس بھی یہ جینز ہوں اور وہ بھی وقت سے پہلے زلزلوں اور طوفانوں سے باخبر ہوسکے۔ بعض جانور اپنی ہی بیماریوں سے پیش از وقت آگاہ ہوجاتے ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ وہ ایک نہایت ہی دلچسپ اضافہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر باسٹرام کہتا ہے کہ جانور روشنی کے سپیکٹرم کی دیگر شعاعوں کی مدد سے مختلف اوقات میں مختلف طریقے سے دیکھ سکتے ہیں مثلاً چیتا رات کی تاریکی میں دیکھ سکتا ہے۔ یہی نہیں بعض اوقات جانور کسی ایسی چیز کو دیکھ رہے ہوتے ہیں جسے ہم نہیں دیکھ سکتے۔ باسٹرام کوئی مذہبی قضیہ قائم کیے بغیر کہتا ہے کہ ممکن ہے وہ اس وقت لائیٹ کے سپیکٹرم یا الیکٹرومیگانیٹک ویوز کے سپیکٹرم کی کسی اور شعاع کی مدد سے کسی شئے کو دیکھ رہے ہوں جو ہمیں دکھائی نہ دیتی ہوں۔ باسٹرام کا خیال ہے کہ ہم ٹرانس ہیومینز بن کر ایسی پراسرار دنیا کو خود دیکھنے کے اہل ہوجائیں گے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بعض جانور سپر نیچرل چیزوں کو دیکھ لیتے ہیں۔ جن میں اُلّو اور بلّی کا خاص طور پر نام لیا جاتا ہے۔ اگر ایسے جانوروں کے جینز انسان کے جینز کے ساتھ ملا کر ٹرانس ہیومنز پیدا کیے جائیں تو وہ شاید فرشتوں، جنات، بھوت پریت یا خدا کے ساتھ بات کرنے کی صلاحیت کے قدرتی طور پر مالک ہوں گے۔

انٹرنیٹ پر مطالعہ کرنے والے قارئین کی دلچسپی کے لیے John Templeton

Foundation کی ویب سائیٹ پر موجود ایریزونا سٹیٹ یونیورسٹی کے سابقہ کئی سالوں کے لیکچرز کا سلسلہ بہت مفید ہوسکتا ہے۔دیکھیے:

https://www.templeton.org/

ان میں خاص طور پر ایک لیکچر ''ٹرانس ہیومنزم اینڈ دی فیوچر آف ڈیماکریسی'' دیکھنے کے قابل ہے۔اس لیکچر میں بھی وہی سوال جو ڈاکٹر باسٹرام نے ہر جگہ اُٹھایا نہایت عمدہ طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ایریزونا سٹیٹ یونیورسٹی کے طلبہ بھی یہی پوچھ رہے ہیں کہ ٹرانس ہیومینز کی پیدائش کے بعد اب ہماری انسانیت کہاں سے شروع ہوگی اور کہاں ختم ہوگی؟ اور یہ سوال بھی کہ جب ہم موجودہ انسان کو ڈائریکٹڈ ارتقاء کے ذریعے ''ہیومن ورژن 0.2'' میں تبدیل کردیں گے تو کیا ہماری رُوح بھی تبدیل ہوجائے گی؟ یہی سلسلہ سوالات جاری تھا کہ ایریزونا سٹیٹ یونیورسٹی نے ایک بالکل نیا پراجیکٹ شروع کردیا۔اگر آپ ابھی ایریزونا سٹیٹ یونیورسٹی کی ویب سائیٹ پر جائیں تو آپ خود اس پراجیکٹ کو دیکھ سکتے ہیں۔اس پراجیکٹ کا نام ہے''صوفیہ پراجیکٹ''(Sophia Project)۔صوفیہ بھی ایھتنا کی طرح دانائی کی دیوی ہے۔صوفیہ پراجیکٹ کے بارے میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ یہ کیا ہے؟اس پراجیکٹ کا مقصد ہے ایسے ٹرانس ہیومینز پیدا کرنا جو سپر نیچرل ہستیوں کے ساتھ بات کرسکیں۔انہوں نے اپنے پراجیکٹ کے مقاصد میں باقاعدہ درج کیا ہے:

۱۔ بھوت پریت سے بات کرنا ۲۔ایلینز کے ساتھ بات کرنا

۳۔فرشتوں کے ساتھ بات کرنا ۴۔جنات اور روحوں کے ساتھ بات کرنا

۵۔کائناتی شعور کے ساتھ بات کرنا یعنی خدا کے ساتھ

انہوں نے اپنے پراجیکٹ کا اصل مقصد ہی یہی بیان کیا ہے اور یہ پراجیکٹ امریکہ جیسے ملک کی ایک بڑی یونیورسٹی میں اس وقت جاری ہے۔

عالم اسلام مدیر[1]

تباہ ہوتا بوسنیا

مسلمان امت بے حس، او آئی سی مردہ، دشمن ظالم اور عیار۔ مسلمانوں کا کیا بنے گا!

دنیا میں اس وقت مسلم امت کس حال میں ہے؟ ہمیں اس کی خبر ہی نہیں۔ دشمن اتنا ظالم اور عیار ہے کہ وہ 'امت' کا لفظ ہی استعمال نہیں ہونے دیتا۔ او آئی سی کو اس نے زندہ ہی نہیں رہنے دیا۔ ہماری حماقت دیکھئے کہ ہم نے اس کا ہیڈ آفس سعودی عرب میں بنا دیا جو امریکہ کا غلام پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔ مسلمان ممالک کی کسی یونیورسٹی میں 'امہ سٹڈیز' کے نام سے کوئی ریسرچ اور سٹڈی سنٹر نہیں ہے جو امت کے مسائل اور ان کے حل کے بارے میں تحقیق کرے اور آگاہی پھیلائے۔ ورلڈ المانک اور ورلڈ ایئر بک کے نام سے سیریز اہل مغرب ہر سال اپنے نقطہ نظر سے طبع کرتے ہیں۔ ۵۷ مسلم ممالک اور ان کے کسی ادارے میں یہ جرأت اور عقل نہیں کہ وہ مسلم ورلڈ ایئر بک ہر سال مختلف زبانوں میں کرے تا کہ امت کو ایک دوسرے کا حال تو معلوم ہو سکے، مسائل کا تو پتہ چلے؛ لیکن ہر سو خاموشی ہے، ایسا جمود اور بے حسی ہے کہ مستقبل کا سوچ کر خوف آتا ہے۔ ہمیں پتہ ہی نہیں کہ افریقہ، یورپ، روس، چین، بھارت، برما وغیرہ میں مسلمانوں پر کیا بیت رہی ہے تو ہم علاج کا کیا سوچیں گے؟ البرہان ایک چھوٹی سی شمع ہے جو ہم جلائے رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم پہلے بھی مقدور بھر عالم اسلام پر لکھتے رہے ہیں اور آئندہ مزید کوشش ہوگی کہ اس ضمن میں کچھ کردار ادا کرسکیں **وما توفیقی الا باللہ العزیز.**

عثمانی ترکوں نے اپنے عروج کے زمانے میں یورپ میں کافی دور تک اسلام پھیلایا تھا۔ چین، روس، پولینڈ، ہنگری، یوکرائن، یوگوسلاویہ، مقدونیہ کے علاقے اس میں شامل تھے۔ جب وہ کمزور ہوئے اور حریفوں نے قوت پکڑی خصوصاً سوویت روس نے تو اس نے ان علاقوں پر تسلط حاصل کر کے اسلام کی بیخ کنی اور مسلمانوں کو مٹانے کے لیے ہر ظالمانہ حربہ استعمال کیا۔ ۱۹۹۱ء میں سوویت روس افغان مجاہدین کی جانفروشی سے ٹوٹا تو اس کے مقبوضات آزاد ہونا شروع

[1] ناظم الدین فاروقی صاحب کے عالمی ترجمان القرآن میں مضمون سے استفادہ

ہوئے۔ سابق یوگوسلاویہ میں سرب اور کروٹ متعصب عیسائیوں نے امریکہ و یورپ کی علانیہ اور خفیہ مدد سے مسلمانوں کو ذلیل و رسوا اور تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ انہوں نے اس علاقے میں کوئی مسلمان عورت ایسی نہیں چھوڑی جس کی انہوں نے عصمت دری نہ کی ہو۔ یہ جنسی استحصال کی ایسی منظم، ہولناک اور شرمناک سازش تھی جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی لیکن ہم مسلمان یہ بے غیرتی برداشت کرتے رہے اور ہمارے کان پر جون تک نہیں رینگی۔ وہ مغربی ممالک جنہیں سوڈان اور انڈونیشیا میں عیسائیوں کا آبرومندانہ اقلیتی کردار گوارا نہ تھا، وہ تین سال تک بوسنیا، برزوگوینا کے مسلمانوں کو لٹتے، کٹتے اور تباہ ہوتے دیکھتے رہے۔ وہ تماشا دیکھتے رہے بلکہ سربوں اور کروٹوں کی اسلحہ وڈالرز سے مدد کرتے رہے کہ مسلمانوں کو تباہ کرکے دل کے ارمان نکال لو چنانچہ مسلمانوں کی ایسی نسل کشی ہوئی کہ آج برسوں بعد بھی اجتماعی قبروں سے لاشیں نکالی جارہی ہیں اور بوسنیا کے بدقسمت مسلمان آج بھی جنگلوں اور پہاڑوں میں اپنے عزیزوں کی ہڈیاں تلاش کرتے ہیں۔ جب او آئی سی خاموش تھی، مسلمان خاموش تھے تو مغرب کیوں حرکت میں آتا؟

یہ کئی سال پہلے کی بات ہے کہ ہم نے سارے دینی مکاتب فکر کی علمی مجلس 'ملی مجلس شرعی' کے ایک اجلاس میں تجویز پیش کی کہ دینی مدارس میں مسلم تاریخ اور جغرافیہ پڑھایا جائے جو اس وقت نصاب کا حصہ نہیں۔ ایک عالم دین فرمانے لگے کہ چلیے تاریخ پڑھانے کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ جغرافیہ پڑھانا کیوں ضروری ہے؟ اس وقت بوسنیا میں لڑائی جارہی تھی۔ مَیں نے علماء کرام سے پوچھا کہ بوسنیا کہاں واقع ہے؟ سارے دین مکاتب فکر کے بڑے علماء موجود تھے، کوئی جواب نہیں دے سکا۔ ہماری تجویز منظور ہوگئی، لیکن صرف کاغذوں میں، کسی دینی مدرسے نے اس پر عمل نہیں کیا۔ معاف کیجیے! ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی اسلامی تاریخ کا مطالعہ لازمی نہیں تو کہاں سے آئے گی صدائے لا الٰہ الا اللہ؟ شفقت محمود جیسے سیکولر و لبرل وزیر تعلیم اور ان کی ایسے ہی معیار پر منتخب ٹیم پاکستان نصاب سے (اسلامیات کے سوا دیگر مضامین سے) چن چن کر حمد و نعت اور اسلامی مواد نکال رہی ہے اور ان کی جگہ ہیومنزم، سیکولرزم اور لبرل ازم کی اقدار ڈال رہی ہے (اور اس پر حسب معمول علماء اور دینی جماعتیں خاموش ہیں) تو ہم کس سے توقع کریں کہ وہ اسلامی تاریخ و جغرافیہ کو اہمیت دے؟۔

ہم اس جذباتیت کے لیے معذرت خواہ ہیں کہ بوسنیا پر مختصر مضمون مرتب کرنے کے لیے قلم اٹھایا تو یہ سطور قلم سے نکل گئیں۔

تو ہم عرض یہ کر رہے تھے کہ جب بوسنیا ہرزوگووینا میں مسلمان اچھی طرح کچلے جا چکے تو امریکہ کو اور اس کی لونڈی اقوام متحدہ کو جنگ بندی اور بحالی امن کا خیال آیا۔ امریکی شہر ڈیٹن میں ایک معاہدہ اس کی زیر نگرانی طے پایا جس میں مسلمانوں کے ساتھ پھر زیادتی کی گئی کہ ان کی آبادی ۵۱ فیصد، رومن کیتھولک کی ۱۵ فیصد اور قدامت پرست عیسائیوں کی ۳۱ فیصد تھی لیکن بوسنیا کو آزاد مسلم مملکت قرار نہیں دیا گیا بلکہ صدارتی کمیٹی میں تینوں کو برابر جگہ دی گئی اور یہ طے کیا گیا کہ ہر دو سال ایک فریق کا صدر ہوگا لیکن چونکہ عیسائیوں کے دو ووٹ ہیں لہٰذا وہ مسلمان صدر کو کام ہی نہیں کرنے دیتے اور یوں بوسنیا کو عملاً مسلم اکثریتی ملک ہونے کے باوجود عیسائی حکمرانوں کے قبضے میں دے دیا گیا ہے۔

۲۰۱۸ء میں عیسائی صدارتی رکن منتخب ہونے سرب صدارتی رکن ملارڈ ڈوڈک سخت متعصب و مسلم دشمن ہے اس نے اپنی سرب فوج الگ سے بنالی ہے۔ ملک کی انتظامیہ، عدلیہ اور فوج کو نہ ماننے کا اس کا اعلان نظام کو مفلوج کر رہا ہے۔ ڈیٹن معاہدے کی پابندی نہ کرنے کا بھی اس نے اعلان کر دیا ہے، سربوں میں گھر گھر کلاشنکوفیں تقسیم کی جارہی ہیں اور بوسنیا کے اہم شہروں پر سرب فوج نے کنٹرول حاصل کرلیا ہے۔ روس اور جرمنی کھلم کھلا سربوں کی ان کارروائیوں کی حمایت کر رہے ہیں۔ انسانی حقوق کے عالمی ادارے اقوام متحدہ اور نیٹو کو متنبہ کر رہے ہیں کہ حالات اس حد تک ناگفتہ ہو چکے ہیں کہ کسی وقت بھی مسلمانوں کا پہلے کی طرح قتل عام شروع ہوسکتا ہے لیکن کسی کو پروا نہیں۔

یہاں دو مزید پہلوؤں کی طرف ہم قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہیں گے۔ ایک یہ کہ خوف و ہراس کی اس فضا میں مسلمان خاندان جان بچانے کے لیے یورپ کے دوسرے ممالک میں پناہ لے رہے ہیں۔ یہ رجحان اگر جاری رہا تو وہ وقت دور نہیں جب مسلمان بوسنیا میں اقلیت میں ہوجائیں گے (کیونکہ انہیں وہاں معمولی عددی برتری حاصل ہے)۔ دوسرے یہ کہ ساری آبادی بھاگ کر کہاں جائے گی؟ کیونکہ بوسنیا چاروں طرف سے متعصب عیسائی مملکتوں میں گھرا ہوا ہے۔

کاش او آئی سی حرکت میں آئے۔ بڑے مسلم ممالک جاگ جائیں۔ ہم حکومت پاکستان سے

درخواست کرتے ہیں کہ وہ مسلم وزرائے خارجہ کا اجلاس اس موضوع پر بلائے اور اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ بوسنیا میں فوراً امن فوج تعینات کرے۔ مسلم ممالک کو چاہیے کہ مل کر بوسنیا کے مسلمانوں کے لیے کوئی کنسورشیم یا ٹرسٹ بنائیں تا کہ بوسنیا کے مسلمانوں کو تباہی سے بچایا جا سکے۔

یوکرائن میں مسلمانوں کی حالتِ زار[1]

یوکرائن میں کریمیا اور ڈونباس کے علاقوں میں مسلم آبادی تقریباً ۲۰ لاکھ کے قریب ہے۔ اس طرح یوکرائن بلغاریہ اور مقدونیا کے بعد یورپ میں مقامی مسلمانوں کی بڑی آبادی رکھنے والا ملک ہے۔ سوویت یونین نے ۱۷۸۳ء میں جزیرہ نما کریمیا پر قبضہ کر کے وہاں مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ ڈونباس کے مسلمانوں کا تعلق تاتار اور کازان نسل سے ہے۔ ۱۹۲۴ء میں سٹالن نے مشرقی یورپ میں فوج کشی کے دوران ڈونباس کی تمام مساجد کو منہدم کر دیا، مسلمانوں کو بزور اسلحہ مرتد بنایا گیا اور انکار کی صورت میں انہیں قتل کر دیا۔ چند لوگ فرار ہو کر ترکی میں پناہ گزین ہوئے۔ ۱۹۹۱ء میں یوکرین کو سوویت یونین سے آزادی ملی تو وہ یورپ کے ساتھ ملحق ہو گیا اور مسلمانوں کو سکھ کا سانس لینا نصیب ہوا۔ انہیں دیگر اقلیتوں کی طرح مساجد بنانے کی اجازت دے دی گئی اور وہ اپنی مذہبی شناخت ظاہر کرنے لگے۔ بحر اسود کے کنارے واقع کریمیا میں روسی بحری فوجی اڈہ بھی موجود ہے جس کے لیے روس نے وہاں ۲۰۱۳ء میں علیحدگی کی تحریک اٹھائی تھی اور ۲۰۱۴ء میں اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کو نسلی بنیادوں پر بری طرح نشانہ بنایا گیا اور مسلمان روسی حمایت یافتہ علیحدگی پسند گروہوں کے ہاتھوں شدید پریشانیوں اور عدم تحفظ کا شکار ہیں جبکہ ایک بڑی تعداد نقل مکانی پر مجبور ہو کر پناہ گزینوں کی زندگی گزار رہی ہے۔ روس نے علاقے میں پانی کی طرح پیسہ بہایا ہے اور اپنے وفاداروں کو وافر مقدار میں اسلحہ فراہم کیا ہے جس کے نتیجے میں ڈونباس کے مسلمانوں کی جائیدادوں اور مکانات پر قبضہ کیا جا رہا ہے اور ان کی عزت، جان اور مال محفوظ نہیں۔

اب روس یوکرائن کے علاقے ڈونباس پر قبضے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ امریکی صدر

---

[1] روزنامہ اسلام میں منصور عادل کے مضمون سے استفادہ

جو بائیڈن نے یوکرائن کے صدر کو فون کر کے اپنی حمایت کا یقین دلایا ہے لیکن صورتحال نازک ہے۔ روسی فوج اس علاقے میں فوجی مشقیں کر رہی ہے اور وہ کسی بھی وقت ڈونباس پر قبضہ کر سکتی ہے۔ یہ علاقہ یوکرائن کے مشرق میں واقع اور جغرافیائی اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں کوئلے کے وسیع ذخائر موجود ہیں جس پر روس کی ہوس زدہ نظریں جمی ہوئی ہیں۔

اس علاقے کے مسلمان یوکرائن کے حامی اور وفادار ہیں۔ اگر روسی دباؤ پر انہیں یہ علاقہ خالی کرنا پڑا تو روسی حمایت یافتہ گروپ اس پر بآسانی قبضہ کر لیں گے۔ یوں ان کی اہمیت امریکہ اور یورپ بھی سمجھ رہے ہیں لیکن چونکہ وہ مسلمان ہیں لہٰذا مغرب ان کے ذکر اور ان کی حمایت سے گریزاں ہے۔

قازقستان میں ہنگامے[1]

وسط ایشیا کے مسلمان ملک جمہوریہ قازقستان میں کئی دنوں سے پرتشدد ہنگامے جاری ہیں۔ یہ علاقہ چین اور روس کے درمیان واقع ہے اور باقی اطراف سے بھی خشکی میں گھرا ہوا ہے۔ یہ ملک تیل اور گیس کے وسیع ذخائر کا مالک ہے اور اپنے رقبے اور معدنی دولت کے لحاظ سے وسط ایشیا کی باقی ریاستوں سے اہم تر ہے۔

قازقستان میں ہنگاموں کی بنیادی وجہ جمہوریت کے نام پر لمبے عرصے تک شخصی حکومت، بدعنوانی اور غلط معاشی پالیسیاں ہیں۔ اس ملک سے روس اور چین کے وسیع تر مفادات وابستہ ہیں۔ چین نے یہاں اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ روس نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ۱۹۹۱ء میں آزاد ہونے والی وسط ایشیائی ریاستوں سے ایک معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے وہ ان ملکوں کی اندرونی و بیرونی سکیورٹی کا ذمہ دار ہے۔ اس معاہدے کے تحت اس نے اپنے فوجی اس وقت قازقستان روانہ کیے ہیں تاکہ امن بحال ہو سکے۔

یوکرائن کے مسئلے پر امریکہ اور روس کے بڑھتے ہوئے اختلافات اور چین کے خلاف امریکہ کی بحر ہند سے لے کر بحر الکاہل تک نئی صف بندی کی روشنی میں قازقستان کے فسادات کو

---

[1] ڈاکٹر رشید احمد خان کے دنیا نیوز میں مضمون سے استفادہ

بیجنگ اور ماسکو میں گہری تشویش کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے خصوصاً امریکی وزیر خارجہ انٹونی بلنکن کی طرف سے قازقستان میں روسی فوجی دستوں کی آمد پر بیان کے بعد روس اور چین اسے ایک بیرونی سازش قرار دے رہے ہیں۔

[سوویت روس سے آزاد ہونے والی سب مسلم ریاستوں کا یہی حال ہے کہ وہاں سوویت روس کی طرز پر جمہوریت کے نام پر آمریت قائم ہے۔ سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی آزادی نہیں۔ معاشی خوش حالی کے اثرات اشرافیہ اور حکمران طبقوں تک محدود اور عوام ان سے محروم رہتے ہیں۔ حکمران رائے عامہ کی پروا نہیں کرتے۔ اسلامی قوتوں کو بھی کام کرنے کی آزادی میسر نہیں حکومتوں نے اسلامی تعلیمات پر عمل کے حوالے سے نہ تو خود ادارے قائم کئے ہیں اور نہ عوام کو کرنے دیئے ہیں۔ یوں مذہبی لحاظ سے بھی لوگوں میں تشنگی اور بے اطمینانی موجود ہے۔ آمریت نے ان ریاستوں کو پولیس سٹیٹ بنا کر رکھا ہوا ہے۔ ان حالات میں عوامی لاوے کا پھٹنا ایک فطری امر ہے۔ اللہ کرے قازقستان کے حکام ان ہنگاموں سے سبق سیکھیں اور عوامی خواہشات کا احترام کرنا سیکھیں۔]

سعودی عرب

ملی مجلس شرعی، جو سارے دینی مکاتب فکر کے علماء کرام کی ایک علمی وفکری مجلس ہے، نے حال ہی میں اپنے ایک اجلاس میں سعودی عرب کے حالات پر تشویش کا اظہار کیا کہ ساری دنیا کے مسلمان حرمین کی وجہ سے سعودی حکومت سے اسلامی تعلیمات پر پابندی کی توقع کرتے ہیں لیکن کچھ عرصے سے وہاں کے حالات کی جو خبریں پہنچ رہی ہیں وہ حوصلہ شکن ہیں کہ وہاں فحاشی وعریانی کو رواج دیا جا رہا ہے، سینما کھولے جا رہے ہیں، کنسرٹ ہو رہے ہیں اور دوسری طرف حرمین میں عبادات پر پابندیاں ہیں، علماء زیر عتاب ہیں اور تبلیغی جماعت جیسی بے ضرر دینی جماعت پر پابندی لگا دی گئی ہے۔

سوال یہ ہے کہ عام مسلمان خصوصاً ہم پاکستانی اس حوالے سے کیا کر سکتے ہیں؟ سوائے دعا کرنے کے اور اظہارِ تشویش کے۔ اگرچہ بعض مکاتب فکر کے علماء نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ

مکہ ومدینہ کو بین الاقوامی شہر قرار دے کر اس کا انتظام وانصرام مسلمان ممالک کی ایک مشترکہ کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے، تاہم ابھی تک یہ بعض مخصوص حلقوں کا مطالبہ ہے جنہیں سعودی عرب کے مذہبی مسلک سے بھی اختلاف ہے۔ سارے مکاتب فکر کے علماء نے یہ مطالبہ نہیں کیا اور نہ حکومت پاکستان اس طرح کے مطالبے کا سوچ سکتی ہے۔

بھارت

بھارت میں ہندوقوم پرست عناصر کو موجودہ حکمرانوں نے کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ نریندر مودی جیسے ہندو نا شسٹ کی سربراہی میں حکومت خود بھی مسلمانوں کو کچلنے اور دیوار سے لگانے کی کوشش کرتی آرہی ہے۔ کشمیر، آسام، بابری مسجد جیسے سانحات کے بعد حکومت شرمندہ ہونے کی بجائے ڈھیٹ بن کر مسلمانوں پر مزید ظلم وستم کی پلاننگ کرنے والے عناصر کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔

ان حالات میں ہندی مسلمانوں کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ ہندی مسلمان اس کا بہتر فیصلہ خود ہی کر سکتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں جو بات آتی ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان کی اخلاقی اور دینی ذمہ داری ہے کہ وہ اس مسئلے کو پوری قوت سے OIC اور بین الاقوامی سطح پر اٹھائے اور بھارتی حکومت کو مسلمانوں پر ظلم وستم نہ کرنے دے۔ خود بھائی مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ ان کی سیاسی ودینی جماعتیں، اگروہ اور ادارے سب اپنا وجود مٹنے سے بچانے کے لیے یک جان ہو جائیں۔ اور اپنے نظریہ حیات سے جڑ جائیں۔ مسلمانوں کی قوت کا منبع بہر حال ان کا دین ہی ہے لہٰذا دین سے تمسک ان کی بہترین پناہ گاہ ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ پلاننگ سے تقسیم کار کر لیں۔ کچھ سیاسی محاذ پر کام کریں، کچھ تعلیمی میدان میں، کچھ سماجی سطح پر اور کچھ دیوانے ایسے بھی ہونے چاہئیں جو آسانی سے قتل نہ ہوں بلکہ دو چار کو مار کر مریں۔ اس کے لیے مسلم نوجوانوں کو فوری طور پر منظم ہو کر اپنے گھروں اور اداروں میں سپہ گری کے مراکز قائم کرنے چاہئیں۔

افغانستان ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

افغان معیشت پر سامراجی حملہ

شرمناک عسکری شکست کے بعد امریکا نے افغانستان میں معاشی تخریب کاری کی مہم وضع کی ہے۔ اس مہم کی کچھ تفصیلات OIC کی حالیہ کانفرنس میں امریکی سفارت کار مارٹن گرفتھ (Martin Griffith) نے اپنے بیان میں پیش کی ہیں۔ اس مہم کے دو پہلو ہیں:

ایک طرف تو امریکا نے اقوام متحدہ کے تعاون سے افغانستان میں خوف و ہراس اور عدم تحفظ کا احساس پھیلانے کے لیے اسی قسم کے جھوٹ بولنا شروع کر دیے ہیں جو وہ ماضی میں شمالی کوریا، کمبوڈیا، وینزویلا، نکارگوا اور یمن کے بارے میں بولا کرتا تھا اور جو سب کے سب بے حقیقت ثابت ہوئے ہیں۔

مارٹن گرفتھ نے مندرجہ ذیل جھوٹ بولے ہیں:

۱۔ افغان معیشت برباد ہوگئی ہے۔ اس بات کا اقرار نہیں کیا کہ جتنی بربادی آئی ہے اس کا اصل ذمہ دار امریکی سامراج ہے جو بیس سال سے افغانستان کو لوٹ رہا ہے۔

۲۔ پوری افغان آبادی تباہ ہو رہی ہے۔

۳۔ ۲۳ ملین افغانی بھوکوں مر رہے ہیں (یعنی مجموعی آبادی کا ستر فیصد)

۴۔ تمام افغان شہری صحت کی سہولتوں سے محروم ہیں

۵۔ ستر فیصد اساتذہ کو تنخواہ نہیں دی جا رہی

۶۔ بیشتر بچے اسکولوں سے باہر ہیں

۷۔ افغان تجارت معطل ہو کر رہ گئی ہے۔

گرفتھ نے یہ جھوٹ ان اعداد و شمار کے سہارے سے مرتب کیے ہیں جو اقوام متحدہ کے

ادارے، تخریب کار گھس بیٹھیے اور این جی اوز سامراج کو فراہم کرتی رہتی ہیں اور جن کا مقصد افغان عوام میں خوف و ہراس اور مایوسی پھیلانے کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس تخیلاتی تصویر کشی کی بنیاد پر امریکا نے سامراجی دراندازی کی جو حکمت عملی تجویز کی ہے وہ حسب ذیل ہے:

سامراج کی معاشی تخریب کاری کی حکمت عملی

- گرِفتھ کے بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امریکی سامراج ڈالروں کے وسیع پھیلاؤ کے ذریعے افغان معیشت پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا ہے۔

- دسمبر ۲۰۲۱ء میں امریکی مقننہ کے ۳۰ ارکان نے امریکا کے افغان معیشت پر از سرنو قبضہ جمانے کے لیے مندرجہ ذیل چار تجاویز پیش کی ہیں:

۱۔ افغانستان کے ۹ بلین ڈالر کے ذخائر یو این او کے کسی ادارے کو دے دیے جائیں۔

۲۔ امریکی پابندیوں کو اقوام متحدہ کے اداروں اور دیگر عالمی سرمایہ دار سامراجی اداروں کے لیے جو افغان معیشت میں دراندازی کر رہے ہیں، نرم کر دیا جائے۔

۳۔ سامراجی ایجنسیوں اور کاروباروں کو افغان ملازمین کی تنخواہیں فراہم کرنے کے لیے رقوم اور سہولتیں دی جائیں۔

۴۔ بین الاقوامی سود خوروں اور سٹہ بازوں کو مالیاتی وسائل فراہم کیے جائیں تا کہ وہ افغان مالیاتی نظام پر قبضہ کر لیں۔

ان شرم ناک تجاویز پر جزواً عمل درآمد شروع ہو گیا ہے مثلاً ورلڈ بینک نے اقوام متحدہ کے ادارے یونیسف کو افغان بچوں میں بانٹنے کے لیے بیس ملین ڈالر دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اقوام متحدہ کا ایک اور ادارہ ورلڈ فوڈ پروگرام بھی اسی قسم کی تخریب کاری کے لیے سامراجی رقوم حاصل کر رہا ہے۔ اقوام متحدہ کے ذریعے امریکی سامراج افغانستان کے قبائلی اور خاندانی نظام کو اپنے سودی جال میں جکڑ لینا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ افغانستان کے بینک کاری نظام پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا ہے۔

گرِفتھ نے کہا کہ ٢٠٢٢ء میں اقوامِ متحدہ ساڑھے چار بلین ڈالر خرچ کرے گی تاکہ ٢١ ملین افغانیوں (موجودہ آبادی کے 69 فیصد) کو سامراجی تخریب کاری کے زیرِ نگیں کرسکے۔

درکار انقلابی حکمت عملی

کل تک امریکا افغانستان پر بموں کی بارش کر رہا تھا۔ افغان عوام کو بے دریغ قتل کر رہا تھا۔ افغان دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا۔ آج وہ انسانی ہمدردی کے راگ الاپ رہا ہے۔ ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر فراہم کی گئی امداد (Humanitarian aid) ایک سامراجی ہتھیار ہے جو اب بموں کی جگہ استعمال کی جا رہی ہے۔ اس لیے اس نئے سامراجی پینترے کو شکست دینے کے لیے مندرجہ ذیل حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے:

١۔ ہمیں یہ احساس ہونا چاہیے کہ اقوامِ متحدہ امریکی خارجہ پالیسی کا ایک ہتھیار ہے۔ اقوامِ متحدہ کے ادارے ہر جگہ امریکی تخریب کاری کو جاری رکھتے ہیں۔ یہ بات شمالی کوریا، کیوبا، وینزویلا، ہانگ کانگ، ہنڈراس اور کئی دیگر ممالک کے بارے میں ثابت ہوچکی ہے۔ اقوامِ متحدہ کے ادارے وہی کردار اب افغانستان میں ادا کر رہے ہیں۔ ان کی سخت ترین نگرانی لازمی ہے۔ کسی صورت ورلڈ بینک، یونیسف، یونیسکو، یو این ڈبلیو ایف پی کو افغان عوام تک رسائی حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ اقوامِ متحدہ طالبان حکومت کی سیاسی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کا کام کر رہی ہے۔

٢۔ یہی کردار وہ این جی اوز بھی ادا کر رہی ہیں جو سامراجی پیسے اور سامرجی ذہنیت رکھنے والی اشرافیہ کے زیرِ تسلط ہیں۔ یہ سب سامراج کا ہراول دستہ ہیں۔ طالبان کو فی الفور تمام این جی اوز کو قومیا لینا چاہیے اور ان کی قیادت مخلصین دین کے ہاتھوں میں منتقل کر دینی چاہیے۔

٣۔ طالبان کو تمام بین الاقوامی صحافتی ایجنسیوں اور نامہ نگاروں کو افغانستان سے فی الفور نکال دینا چاہیے اور قومی پریس پر کڑی نگرانی کا انتظام کرنا چاہیے تاکہ وہ سامراجی جھوٹ پھیلا کر عوام کو گمراہ نہ کرسکیں۔

۴۔ حکومت فی الفور ایک رسدی کمیشن قائم کرے۔ تمام بیرونی امداد یہی ادارہ وصول کرے اور اس امداد کی ملک گیر تقسیم کا یہی ادارہ ذمہ دار ہو۔ کسی غیر سرکاری ادارے کو غیر ملکی امداد حاصل کرنے کی یا عوام میں تقسیم کرنے کی اجازت نہ ہو۔

۵۔ مالیاتی شعبہ میں حکومتی اجارہ داری فوراً قائم کی جائے۔ یہ مالی سامراجی تخریب کاری کو ناممکن بنانے کے لیے اشد ضروری ہے۔ تمام بینکوں اور مالیاتی اداروں کو فی الفور قومی تحویل میں بلا معاوضہ لے لیا جائے۔ معیشت سے غیر ملکی کرنسیوں (بالخصوص ڈالر اور پاکستانی روپیہ) کے پھیلاؤ کو بتدریج ختم کیا جائے۔ بتدریج ایک نئی کرنسی (اسلامی دینار) کا ملک گیر اجرا کیا جائے۔ قرضہ جاتی نظام کو تمویلی نظام سے تبدیل کیا جائے۔

۶۔ انقلاب کا پہلا سال (سوویت یونین ۱۹۱۸ء، چین ۱۹۴۹ء، کوریا ۱۹۵۳ء) ہر جگہ گھمبیر ہوتا ہے۔ صورت حال اتنی گھمبیر نہیں جو سامراجی تصویر کشی سے ظاہر ہے۔ مثلاً یہ پیش گوئی کہ ۲۰۲۲ء میں مجموعی قومی پیداوار ۳۰ فیصد گرے گی اور بے روزگاری کی شرح ۲۹ فیصد تک پہنچ جائے گی مضحکہ خیز ہے۔ اسلامی حکومت کو بیرونی امداد کی یقیناً ضرورت ہے لیکن اس امداد کے حصول کے لیے انقلابی خودکشی کرنا دانش مندی نہیں۔

طالبان کو یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ دنیا بھر میں سرمایہ دارانہ حکومتیں ان کی ہمدرد اور بہی خواہ نہیں۔ ان کے فطری ہمدرد وہ مخلصین دین ہیں جو لاکھوں مدارس اور مساجد میں موجود ہیں۔ جلد از جلد پاکستان، ایران، ترکی، ملائشیا اور انڈونیشیا میں افغان اعانتی فنڈ قائم کرنے کے لیے ان ممالک کے علما، ائمہ مساجد، تجار، صنعت کار اور اسلامی جماعتوں سے روابط پیدا کرنے چاہئیں تاکہ حصولِ وسائل کا ایک ہمہ گیر نظام قائم ہو جائے اور ان حلقوں میں یہ احساس پیدا ہو کہ افغان انقلاب ان کا اپنا انقلاب ہے اور اس کی مدد کرنا اپنے ملک کی تحریک تحفظِ دین اور غلبۂ دین کی مدد کرنے کے مترادف ہے۔

عالم اسلام/افغانستان ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

اسلامی افغانستان
عوامی اور اسلامی حلقوں کی حمایت سے محروم کیوں؟

مسلم ممالک خصوصاً پاکستان میں خصوصاً پاکستان افغان اسلامی انقلاب کی عوامی تائید کو توسیع دینے اور اس کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تائید ابھی تک محدود، مبہم اور دبی ہوئی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مخلصینِ دین افغان اسلامی انقلاب کی نظاماتی اہمیت سے واقف نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ افغان اسلامی انقلاب غلبۂ دین کی عالمی جدوجہد میں ایک بنیادی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہماری یہ جدوجہد سامراجی سرمایہ داری کے عالمی غلبہ کو مسخر کرنے کی جدوجہد ہے۔ ہم نے یہ جدوجہد اس وقت سے جاری رکھی ہوئی ہے جب سے سامراج کا مسلم دنیا پر غلبہ ہوا۔ سامراجی غلبہ کا بنیادی آلہ کار سرمایہ دارانہ ریاست ہے لہٰذا غلبہ دین کی جدوجہد سرمایہ دارانہ ریاست کو مسخر کرکے اسلامی ریاست کے قیام اور استحکام کی جدوجہد ہے۔ یہ کوشش کئی جگہ کامیاب ہوئی ہے مثلاً الجزائر، چیچنیا، مالی، صومالیہ، عراق، شام، مصر، فلسطین کے کچھ علاقے اور ایران لیکن ایران کے علاوہ کہیں بھی یہ کامیابیاں دیرپا ثابت نہ ہوسکیں اور اسلامی ریاست قائم کرنے کی جدوجہد کو سامراج نے پسپا کرکے قومی سرمایہ دارانہ ریاستیں قائم کردیں۔

افغانستان میں ہم نے جو جنگ جیتی ہے سامراج کی کوشش ہے کہ اس کو بھی شکست میں تبدیل کردے اور افغانستان کی اسلامی حکومت ایک ایسی قومی ریاستی نظام کی داغ بیل ڈالے جو عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں انضمام پر راضی ہو جائے۔ سامراج کے لیے اس مقصد کو حاصل کرنا آسان نہیں کیونکہ طالبان نے کوئی قومی آزادی کی جنگ (war of national liberation) نہیں لڑی اور قومی سرمایہ دارانہ ریاست کا قیام جہاد فی سبیل اللہ کا فطری تتمہ نہیں ہوسکتا۔ طالبان نہ بولشوائی ہیں نہ مارکسسٹ، نہ ویٹ کانگ نہ شیوسینا۔ وہ مجاہدین اسلام ہیں۔ ان کی جدوجہد اسی جہاد کا تسلسل ہے جو سید احمد شہید رحمہ اللہ نے سامراج کے خلاف 1830ء کی دہائی میں برپا فرمایا تھا۔

مسلم دنیا کے مخلصینِ دین کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ افغانستان میں اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد عالمی غلبہ دین کی جدوجہد کا پیش خیمہ ہے۔ ہم تحکم سرمایہ سے کہیں بھی نجات حاصل

نہ کر سکے ہیں (اس ضمن میں ہماری کامیابی ایران میں بھی بری ہے)۔ اگر افغانستان میں ایک مستحکم غیر سرمایہ دارانہ ریاستی نظام قائم ہو گیا تو یہ دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں کے لیے زریں مثالیہ ثابت ہوگا اور عالمی سرمایہ دارانہ نظاماتی غلبہ کو اکھاڑ پھینکنے کی راہ کھل جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ سامراج آج اس بات کی بھرپور کوشش کر رہا ہے کہ افغان معیشت کو عالمی سرمایہ دارانہ فنانشل نظام میں ضم کرنا ہے۔ اس سامراجی حکمت عملی کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ سرمایہ دارانہ زر کی غلاظت سے افغان معیشت کو بھر دے۔ جیسا کہ امریکی وزارت خارجہ کے نمائندہ نیل پرائس (Neil Price) نے اپنے حالیہ بیان میں انکشاف کیا ہے کہ سرمایہ دارانہ ممالک ایک ایسے منصوبہ پر کام کر رہے ہیں جس کے ذریعہ افغان بینکوں کو حکومت افغانستان کے توسط کے بغیر ڈالروں سے بھر دیں اور افغان معیشت ڈالرائز ہو جائے اور یوں اس ملک کی معاشی خودمختاری (Economic Sovereignty) کی بیخ کنی کر دی جائے۔ دوسرے یہ کہ سامراجی بھیک کی فراہمی اس شرط پر کی جائے کہ طالبان غداروں کو حکومت میں شامل کریں۔ انسانی (شیطانی؟) حقوق Human Rights) کو تسلیم کریں اور عورتوں کی عریانی اور فحاشی کو برداشت کرنے پر تیار ہو جائیں۔

مسلم حکومتیں بالخصوص عمران خان کی حکومت اس سامراجی دہشت گردی کو فروغ دینے کے لیے ایک پل کا کام کر رہی ہے۔ پاکستان کی افغان پالیسی کا اولین مقصد امریکا کو خوش کرنا ہے۔ عمران خان اور اس کی سرکار مسلسل افغان طالبان پر دباؤ ڈال رہی ہے کہ سامراجی سرمایہ داری کے مطالبات منظور کر کے گھٹنے ٹیک دے۔ مخلصینِ دین کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ مسلم حکمران اپنے سرمایہ دارانہ مفادات کی خاطر سامراج کو افغانستان میں وہ جنگ جتوانا چاہتے ہیں جو امریکا میدانِ کارزار میں ہار چکا ہے۔ مسلم حکومتیں افغان انقلاب اور قیامِ ریاستِ اسلامی کی راہ میں مزاحم ہیں۔

انقلاب کا پہلا سال مسائل اور مصائب سے بھرا ہوا ہے۔ ان مسائل سے اس طرح نبرد آزما ہونا کہ وہاں عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے منسلک ایک ریاستی نظام قائم نہ ہو، ایک دشوار گزار عمل ہے اور مخلصین دین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس نازک مرحلہ پر اپنے افغان بھائیوں کی بھرپور اعانت کریں۔ اس اعانت کی صورتیں مندرجہ ذیل ہو سکتی ہیں:

ا۔ سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ اسلامی حلقے اس بات کا احساس کریں کہ طالبان کی کامیابی پر ہماری اپنی دینی تحریکوں کی کامیابی کا انحصار ہے۔ اہلِ دین کی ہر اجتماعیت طالبان

حکومت کی حمایت کا اقرار کرے۔مخلصین دین اپنے ملک کے عوام میں انقلاب افغانستان کے ترجمان بن جائیں۔تمام اسلامی گروہ (سیاسی اور غیر سیاسی) حکومت پر زور دیں کہ وہ امارت اسلامیہ کو فی الفور تسلیم کرے اور اپنی سامراج نواز افغان پالیسی سے رجوع کرے۔

۲۔ ملک میں جاری طالبان مخالف پروپیگنڈا کے خلاف مستقل احتجاج کریں اور انگریزی پریس کے لیے ناممکن بنادیں کہ اس مذموم پروپیگنڈا کو جاری رکھے۔انگریزی اخبارات ڈان اور ٹریبون اور ان سے منسلک اداروں کو بالخصوص اس احتجاجی مہم کا ٹارگٹ بنائیں۔

۳۔ اس کا امکان موجود ہے کہ حالیہ موسم سرما میں افغانستان کے مخصوص علاقوں میں غذائی قلت پیدا ہو۔سامراج اس کی بھرپور کوشش کررہا ہے کہ وہاں غذائی قلت پیدا کرے اور اس ضمن میں جھوٹے پروپیگنڈا کے ذریعے افغان عوام میں ہیجان پیدا کرے۔اس مذموم مہم کو ناکام بنانے کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان، ایران، ملائشیا، انڈونیشیا کے زیادہ سے زیادہ مساجد، مدارس اور اسلامی جماعتوں میں "افغان اعانتی فنڈ" قائم ہوں جس کے ذریعہ منصوبہ بندی کے تحت اعانت فراہم کی جائے۔تاجروں اور صنعت کاروں کو بالخصوص متوجہ کیا جائے۔

۴۔ افغان معیشت 1979ء سے لے کر 2020ء تک عالمی سرمایہ دارانہ لوٹ مار کا شکار رہی ہے۔آج امریکا اور اقوام متحدہ افغانستان کی ملکی معیشت کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں ضم کرنے کی کوشش کررہے ہیں، اس کا ایک ضمنی مقصد اس لوٹ مار کو جاری رکھنا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ افغانستان ایک نسبتاً (potentially) امیر ملک ہے جس کے انسانی اور معدنی وسائل بہت وافر ہیں۔سامراج ان وسائل کو لوٹ کر سرمایہ کے عالمی چکر کے ماتحت کرنا چاہتا ہے۔ان وسائل سے کماحقہ فائدہ اٹھانے کے لیے ماہرین درکار ہیں۔ایسے ماہرین جو سرمایہ دارانہ ذہنیت اور سرمایہ دارانہ روحانیت سے متاثر نہ ہوں۔الحمدللہ! اسلامی جماعتوں اور دیگر مخلصین دین کے حلقوں میں ایسے انجینئروں، ڈاکٹروں، قانون دانوں اور پالیسی ساز ماہرین کی کمی نہیں۔اسلامی تحریکوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان ماہرین کو افغان تعمیری منصوبوں سے منسلک کرنے کے لیے منصوبہ بندی کریں۔اس بات کے اہتمام کی ضرورت ہے کہ ماہرین کی یہ فراہمی حکومت پاکستان یا اقوام متحدہ کے اداروں کے کسی افرادی قوت کی فراہمی کے پروگروام کا حصہ نہ ہو کیونکہ حکومت پاکستان اور اقوام متحدہ کے ادارے تو افغان معیشت کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں ضم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

CPL No. 296 February 2022

نیا ایڈیشن چھپ کر آ گیا ہے

اسلام اور تزکیۂ نفس

مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

صفحات ۹۲۸

اسلام میں تعمیر شخصیت کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی دوسری پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ

مکتبہ البرہان لاہور